DUE DATE

Cl. No. ____________ *Acc. No.* ____________

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

مجلسِ مُنتظِمہ

ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا
(صدر، انجمنِ اسلام، ممبئی)

جناب عبدالمجید پاٹکا
(اعزازی جنرل سکریٹری)
(انجمن اسلام ممبئی)

جناب رضوان فاروقی
(ایگزیکٹیو چیئرمین)
(ہائر ایجوکیشن بورڈ)

جناب سمیع خطیب
(ایگزیکٹیو چیئرمین)
(ریزیڈنسیل ایجوکیشن بورڈ)

جناب جی آر اے شیخ
(دارالعلوم ٹرسٹ بورڈ پنچ گنی)

ڈاکٹر شفیع شیخ
(ممبر جنرل کاؤنسل)

ڈاکٹر آدم شیخ
(ممبر سکریٹری)

مشاورتی کمیٹی، نوائے ادب

جناب معین الحق چودھری
(ممبر)

جناب خورشید نعمانی
(ممبر)

پروفیسر ظہیر علی
(ممبر)

پروفیسر انور ظہیر
(ممبر)

ڈاکٹر آدم شیخ
(ایڈیٹر)

نوائے ادب

ششماہی

مدیر

ڈاکٹر آدم شیخ

جلد ۴۸ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۸ء

مندرجات

۱۔	خشتِ اول (اداریہ)	مدیر	۳
۲۔	سفر جاری ہے (ہماری کوششیں)	ادارہ	۴
۲۔	دارالمصنفین ــــ مولانا شبلی کی تصنیفی تحریک	ڈاکٹر خورشید منظر الحق نعمانی	۶
۴۔	ہندوستان میں فارسی کا تہذیبی سرمایہ	ڈاکٹر شریف حسین قاسمی	۲۲
۵۔	فنِ مکتوب نگاری	ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی	۲۹
۶۔	خاندیش میں اردو شاعری کی روایت	ڈاکٹر اکبر رحمانی	۵۰
۷۔	نقطۂ نظر (تبصرے)	مُرتبہ: پروفیسر ظہیر علی مُبصّرین: پروفیسر ظہیر علی اِرتضیٰ نشاط	۶۱
۸۔	بازگشت (قارئین کے خطوط)	ادارہ	۶۸
۹۔	مقالہ نما	مرتبین: ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی ڈاکٹر خورشید نعمانی پروفیسر انور ظہیر خان	۷۰

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

مطبوعات و تالیفات

۱۔ لغاتِ گجری (مرتبہ)	——	پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی
۲۔ ولی گجراتی (مولفہ)	——	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
۳۔ نوائے آزادی (مرتبہ)		جناب عبدالرزاق قریشی
۴۔ مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)		جناب عبدالرزاق قریشی
۵۔ مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)		جناب عبدالرزاق قریشی
۶۔ مبادیات تحقیق (مولفہ)		جناب عبدالرزاق قریشی
۷۔ راگ مالا (مولفہ)		جناب عبدالرزاق قریشی
۸۔ نقطے اور شوشے (مصنفہ)	——	ڈاکٹر عابد پشاوری
۹۔ مخطوطات جامع مسجد بمبئی (مرتبہ)	——	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
۱۰۔ مقالہ نما (مرتبہ)	——	محترمہ رقیہ انعامدار

خشتِ اوّل

"نوائے ادب" کا تازہ شمارہ حاضر خدمت ہے، کسی رسالے کو مرتب کرنے کا میری زندگی کا یہ پہلا تجربہ ہے، اس لئے خاکسار کو زعمائے ادب اور قارئین کرام کے تاثرات کا شدت سے انتظار رہے گا تاکہ ان کی روشنی میں آئندہ شماروں کو خوب سے خوب تر بنایا جا سکے۔

نوائے ادب، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ترجمان ہے۔ ادارے کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر، اس رسالے میں چند مخصوص موضوعات کو ترجیح دی جاتی ہے اور اکثر انہیں کے تعلق سے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ حالات اور تقاضے کچھ ایسے ہیں کہ ہمارے لئے اب ان حدود سے باہر نکلنا ضروری ہو گیا ہے، اسی لئے نوائے ادب میں اردو کے علاوہ عربی، فارسی، اسلامیات اور مراٹھی کے تعلق سے بھی تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ایک تحقیقی ادارے کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء میں ممبئی یونیورسٹی سے الحاق ہوا تھا، آپ واقف ہیں کہ گذشتہ پچاس سالوں میں انسٹی ٹیوٹ نے علم و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں، اب ممبئی یونیورسٹی نے اس انسٹی ٹیوٹ کو عربی، فارسی اور اسلامیات میں تحقیق و تنقید کے لئے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ لہٰذا اب یہاں سے اردو کے علاوہ مذکورہ مضامین میں پی ایچ ڈی ڈگری کے لئے رجسٹریشن کیا جا سکے گا، نیز مذکورہ مضامین میں تحقیق کرنے والے طلباء اور اساتذہ، اردو، فارسی، عربی انگریزی اور مراٹھی کے کم و بیش پچیس ہزار کتب و رسائل کی اس ایک لائبریری سے استفادہ کر سکیں گے۔

ماہر لسانیات اس امر کی تصدیق کریں گے کہ اردو اور مراٹھی زبانوں میں عہد قدیم سے فکری، لسانی اور تہذیبی رشتے موجود ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور صوفی سنتوں نے فکری فنی و لسانی لین دین کے ذریعے اردو اور مراٹھی کو قریب سے قریب تر لانے کی کوششیں کیں اور لاشعوری طور پر قومی یکجہتی کے جذبات کو فروغ دیا۔ اسی فکری و لسانی لین دین کی مبارک روایت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اردو والے سنت نامدیو، گڈکری، جنیت دلوی اور نارائن سروے سے متعارف ہوئے ہیں اور مراٹھی والوں کو غالب، اقبال، عصمت چغتائی اور کرشن چندر جیسے اردو کے ممتاز فنکاروں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اردو اور مراٹھی کے اسی رشتے کو مزید استوار کرنے کے لئے انجمن اسلام ممبئی نے مراٹھی وانگمے منڈل کی بنیاد رکھی ہے اور یہ طے کیا ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں مراٹھی کی دس ہزار کتابوں پر مشتمل ایک شعبہ قائم کیا جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ اردو اور مراٹھی کو قریب لانے کی انجمن اسلام اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی یہ مہم ان زبانوں کے طلباء اور علماء کے لئے کافی مفید ثابت ہوگی۔

۲۵؍ نومبر ۱۹۹۷ء سے راقم الحروف نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت ڈائرکٹر اور مدیر نوائے ادب، ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر گوریکر اب سبکدوش ہو گئے ہیں تاہم ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے پیش نظر، انجمن اسلام نے انہیں پروفیسر ایمیریٹس کا خطاب عطا کیا ہے۔

نوائے ادب کے قارئین اور تخلیق کاروں سے گذارش کی جاتی ہے وہ ہمیں اپنے تاثرات اور قیمتی مشوروں سے ضرور نوازیں تاکہ کوتاہیوں اور خامیوں کو دور کر کے اس مجلے کو ہر پہلو سے خوبصورت بنایا جا سکے۔

● آدم شیخ

ہماری کوششیں ادارہ

سفر جاری ہے ....

انجمن اسلام، ممبئی

(۱) ۲۳ دسمبر ۱۹۹۷ — دسویں یوسف مہر علی میموریل لکچر کے تحت ملک کے مایہ ناز سائنسداں جناب ڈاکٹر ظہور قاسم، چیرمین، بورڈ آف گورنرس، دہلی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی نے ''سائنسی ارتقاء میں مسلمانوں کا کردار'' کے عنوان سے ایک فکر انگیز اور جامع مقالہ پیش کیا۔ اس علمی نشست کی صدارت ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، صدر انجمن اسلام ممبئی نے فرمائی۔

(۲) ۱۸ جنوری ۱۹۹۸ — انجمن اسلام کے داخلی ترجمان ''آواز انجمن'' کے تازہ شمارے کا اجراء ہوا۔ اس شمارے میں انجمن اسلام طبیہ کالج اینڈ ہاسپٹل کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔

(۳) ۱۳ فروری ۱۹۹۸ — انجمن اسلام ممبئی نے جناب محمود الرحمن صاحب آئی اے ایس، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو شاندار استقبالیہ دیا جس میں شہر کی ممتاز علمی، ادبی اور سماجی ہستیوں نے شرکت کی۔ اس مجلس استقبالیہ میں ان امور پر گفتگو ہوئی کہ کس طرح انجمن اسلام ممبئی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء، اساتذہ اور منتظمین میں زیادہ سے زیادہ روابط قائم کئے جائیں۔ اسی طرح دونوں اداروں کے معاہدہ کے پیش دیں کے تعلق سے بھی کئی تجاویر زیر بحث رہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب صدر نشیں رہے۔

(۴) ۸، ۹ مارچ ۱۹۹۸ — صدر انجمن اسلام ممبئی، انجمن اسلام کے مختلف اداروں میں مصروف کار مراٹھی اساتذہ اور دیگر حضرات کی اجتماعی کوششوں سے مراٹھی وانگمے منڈل یا رم ادب، مراٹھی کی تشکیل کے بعد دوسری اہم کانفرنس گیارہ اور بارہ مارچ کو الاء لطیفی ہال میں منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کا افتتاح مشہور ادیب پروفیسر پشپا بھاوے نے کیا۔ سوینر کا اجراء مراٹھی کے مشہور شاعر پدم شری نارائن سروے نے کیا۔ پروفیسر گنگادھر گاڈگل نے مسلم مراٹھی ادب کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ اس افتتاحی اجلاس میں صدارتی ذمہ داری ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب نے سنبھالی اور اردو مراٹھی زبان و ادب کے قدیم و جدید رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے مراٹھی کے مسلم ادیبوں کی کوششوں کو سراہا۔

(۵) ۲۱ مارچ ۱۹۹۸ — حاجی محمد صابو صدیق پالی ٹکنک میں مرین انجینیرنگ کے اہم ڈپلوما کورس کا افتتاح، صدر انجمن اسلام ممبئی، ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کے ہاتھوں ہوا۔ مرین انجینیرنگ کے اس ڈپلوما کورس کی منظوری مرکزی حکومت کی قدر شناسی کی غماز ہے۔ صابو صدیق پالی ٹکنک ملک کا دوسرا ادارہ ہے جسے اس کورس کی منظوری دی گئی ہے۔

(۶) ۲۷ مارچ ۱۹۹۸ — صابو صدیق پالی ٹکنک میں صحافت یا جرنلزم کورس کی ابتدا کی گئی۔ ملک کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے والے اس کورس کے توسط سے نوجوانوں کو روزگار کے کئی عمدہ مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ اس کورس میں داخلہ لینے والوں میں اکثریت لڑکیوں کی ہے۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

(۱) ۲۵ نومبر ۹۸ء — نئے انتظامیہ کے تحت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کو طلباء، اساتذہ اور ادباء کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد بنانے کی مہم شروع کی گئی۔ نیز تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مناسب سہولتوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔

(۲) جنوری ۹۸ — ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں مراٹھی زبان و ادب کی کم و بیش دس ہزار کتب کا ذخیرہ کرنے کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے، دس ہزار روپیوں کی کتابیں خرید کر مراٹھی سکشن کی ابتدا کی گئی۔ صدر انجمن اسلام ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صاحب کی سرپرستی میں اردو مراٹھی کو قریب لانے کے پروگرام کی یہ پہلی مستحسن کوشش ہوئی۔

(۳) ۲۲ دسمبر ۱۹۹۷ — انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر آدم شیخ نے شعبہ عربی، یونیورسٹی آف ممبئی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سیمینار میں "عربی زبان و ادب کی ترقی میں ہندوستان کا حصہ" کے عنوان سے اظہار خیال فرمایا۔

(۴) ۱۹ فروری ۱۹۹۸ — بے سہارا خواتین کی نگہداشت کرنے والے انجمن اسلام ممبئی کے یونٹ "سہارا" کے یک روزہ ورک شاپ کا انسٹی ٹیوٹ کے ریڈنگ ہال میں اہتمام کیا گیا۔

(۵) ۲۱ فروری ۱۹۹۸ — ڈاکٹر آدم شیخ انسٹی ٹیوٹ کی نمائندگی کرتے ہوئے، انجمن اسلام اکبر پیر بھائی کالج میں برپا "معین الدین حارث ٹرافی برائے بیت بازی" کے جلسے میں بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے اور شعر گوئی کی ایک ادبی روایت کی تجدید میں حصہ لیا۔

(۶) ۱۱ر۱۲ مارچ ۱۹۹۸ — اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے شعبۂ فارسی یونیورسٹی آف ممبئی کے اشتراک سے "فارسی زبان و ادب" کے موضوع پر توسیعی لکچروں کا اہتمام کیا۔ دو روز تک جاری رہنے والے اس سیمینار میں پروفیسر امیریٹس ڈاکٹر امیر حسن عابدی (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ اظہر (اسکول آف افرو ایشین لینگویجس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ دہلی)، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (شعبہ فارسی۔ دہلی یونیورسٹی)، اور ڈاکٹر شعیب اعظمی (شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، اسلامی جمہوریہ اسلام، ایران کے ہندوستان میں قونصل جنرل ہزایکسیلنسی جناب سید کمال یاسینی، اور ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر جناب فرہاد پالیزدار شریک ہوئے اور فارسی زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

(۷) ۱۱ر۱۲ مارچ ۱۹۹۸ — مذکورہ دنوں میں ایران کلچر ہاؤس کے تعاون سے فارسی، انگریزی اور اردو کتابوں کی دو روزہ نمائش بھی ہوئی۔ یہاں عوام کو کئی نایاب کتابوں کے دیکھنے کا موقع ملا۔

(۸) ۲۶ مارچ ۱۹۹۸ — انسٹی ٹیوٹ کی سرپرستی میں ڈاکٹر داؤد کشمیری کی دو نئی کتابوں "بس" اور "سردار جعفری کی شاعری — فن یا مدفن" کا اجراء، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا صاحب کے ہاتھوں ہوا۔ اس کے علاوہ ایک بامعنی اور بامقصد مباحثہ بھی ہوا جس میں ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، ڈاکٹر آدم شیخ، ڈاکٹر داؤد کشمیری، عبداللہ کمال، انور خان، پروفیسر انور ظہیر اور پروفیسر احمد انصاری نے سردار جعفری کے فکر و فن پر اظہار خیال کیا۔ اسی تقریب میں ڈاکٹر داؤد کشمیری نے بذات خود، سامعین کے کئی سوالوں کا تشفی بخش جواب دیا۔ صدارت ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صاحب نے کی۔

(۹) انسٹی ٹیوٹ کو ممبئی یونیورسٹی نے جون ۱۹۹۷ سے عربی، فارسی اور اسلامیات میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے کورس کے لئے دائمی منظوری دے دی۔ اب اردو کے علاوہ ان مضامین میں بھی پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹریشن کیا جا سکے گا۔

دارالمصنفین ــــ مولانا شبلی کی تصنیفی تحریک

ڈاکٹر خورشید مظہر الحق نعمانی

(سابق استاد۔ شعبۂ اردو۔ مہارشی دیانند کالج۔ ممبئی)

(قسط اوّل)

۱۸۵۷ کا سال ہندوستان کی سیاسی و ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، قدیم و جدید کے درمیان۔ یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے، سلطنت مغلیہ جو ایک عرصہ سے ہندوستان کی سیاسی وحدت کی محافظ رہی تھی اس کا چراغ گل ہوگیا اور ملک پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا، تاریخ کا ایک عہد آفریں دور ختم اور دوسرا شروع ہوا، پرانا سیاسی نظام دم توڑ گیا اور نیا نظام وجود میں آیا۔

اس سانحہ عظیم و سیاسی تمدنی بربادی یعنی غدر کی داستان مختلف لوگوں نے مختلف نقطۂ نظر سے بیان کی ہے۔ بغاوت ۱۸۵۷ کی ناکامی کے بعد جب انگریزوں نے بہیمیت اور بربریت کے ساتھ ہندوستانیوں کو پسپا کر کے خوف و دہشت کی فضا پیدا کی اور اس واقعہ کو غدر کے نام سے موسوم کیا ہندوستانیوں نے پہلے اسے غدر ہی کہا لیکن جب دلوں پر سے خوف کے پردے ہٹے۔ سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو ان کا نقطۂ نظر بدلا، غدر سے ہنگامہ ۱۸۵۷ اور پھر تحریک جنگ آزادی ہوا، یہ الفاظ بدلتی ہوئی سیاسی فضا کے آئینہ دار ہوگئے اور آخر میں اس واقعہ کو جنگ آزادی کی اولین کوشش قرار دیا گیا انگریزوں نے اقتدار چونکہ مسلمانوں سے چھینا تھا اس لئے انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور انہیں اپنا مد مقابل سمجھتے تھے۔ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں میں یہ خیال عام تھا کہ انگریز ان کے دشمن ہیں۔ جذبہ انتقام میں انہوں نے دل کھول کر بے پناہ ظلم ڈھائے اور سارے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں ڈال دیا۔ لاکھوں معصوم و بے گناہ انسان ظلم اور بربریت کا شکار ہوئے، سر بازار لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ گولیوں کا بے محابا نشانہ بنایا گیا، مسلمانوں پر خصوصاً عرصۂ حیات تنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

غالب غدر کے عینی شاہد تھے انہوں نے ہرچند غدر ہندی ۱۸۵۷ کو ''رستخیز بے جا'' سے تعبیر کیا ہے لیکن ان کی تحریریں، خطوط اور تصنیف ''دستنبو'' (جو غدر کی ڈائری کی حیثیت رکھتی ہے) ان پیش آمدہ سانحات کا جیتا جاگتا مرقع ہیں، غدر ان کے لئے کوئی معمولی انقلاب نہ تھا بلکہ ان کی تہذیب کی شکست و ریخت اور اقدار کی مکمل تباہی تھی جو انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ انہوں نے دلی پر آنے والی پے بہ پے آفات کو دیکھا اور اپنے خطوط میں ان کا بیان کیا ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''اس شہر پر پانچ لشکروں کا پے بہ پے حملہ ہوا، پہلے باغیوں کا، جس میں شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا خاکیوں کا، اس میں جان و مال

عزت و ناموس، مکان و مکین، آسمان و زمین اور آثار ہستی لٹ گئے'' (۱)
(باقی تین لشکر قحط، ہیضہ اور تپ کے تھے جس میں کئی آدمی مر گئے)
ایک اور خط میں لکھتے ہیں

''میرا حال سوائے میرے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں اگرچہ اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں بھی فرق آگیا ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے۔ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، کوئی نہ مجھے میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو غم مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ انگریزوں کی قوم میں جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں میرا کوئی امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست تھا اور کوئی میرا یار، کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ دوست کچھ عزیز کچھ شاگرد کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کی زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا'' (۲)

دستنبو سے بھی ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے

''بڑے بڑے عالی خاندان کے لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لئے تیل نہیں ہے۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے، بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہے اور پیمانہ کدھر ہے'' (۳)

اس تحریک سے سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں علیحدگی پسندگی کا جو رجحان بڑھ رہا تھا وہ ختم ہو گیا اس جنگ میں ہندو مسلمان سبھی رسما تھے اور لاکھوں کی تعداد میں دونوں مذہبوں کے ماننے والے بہادر شاہ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے تھے کیونکہ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ عیسائیت ان کے مذہب کو نیست و نابود کر دے گی، سب ملک کی آزادی کے لئے کوشاں تھے لیکن انگریزوں کے تسلط کے بعد یہ خوبصورت اتحاد ختم ہو گیا انگریزوں نے سب سے پہلے فرقہ وارانہ نفاق کا بیج بویا اور چونکہ مسلمان حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان پر طرح طرح کی زیادتیاں کرنا شروع کیں اور ان کے مقابلے میں ہندوؤں کی سرپرستی کی تاکہ اس طرح آپس میں بد دلی پیدا ہو

غالب کی طرح دوسرے اہل علم بھی ان افسوسناک واقعات سے متاثر ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے تاثرات قلمبند کئے وہ لکھتے ہیں۔۔

''اور یہ وہ معرکہ تھا جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل ہو گئی تھی اور مغلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی اور کار خانۂ اسلام کا تہ و بالا ہو گیا تھا مسلمان ہونا ہی جرم ہو گیا تھا۔ اکابر دین کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ہر مسلمان سراسیمہ حال تھا، ہر مومن شکستہ حال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ نہ میں تھا اور نہ تو مجھ کا حال تھا۔ یا نفسی نفسی کا مقال تھا۔ جتنا جو بڑا تھا اتنا ہی بڑا اس پر صدمہ تھا۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے اور بعض جو بچ اجل سے بچے۔ اس ملک سے ہجرت فرما گئے۔ ہندوستان میں اسلام پر

۱۔۔ عود ہندی۔۔ غالب ص ۸۸،۸۹ (۲)۔۔ ایضاً ص ۱۳۳ (۳)۔۔ ترجمہ دستنبو از دوئے معلی غالب نمبر (جلد دوم) ص ۱۸۷

قریب قریب اسی کے صدمہ عظیم واقع ہوا تھا۔ جیسے حضرت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر کل اسلام پر۔ مسلمانوں کی قلت، کفار کی کثرت، کفر کی شدت، بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین نسیاً منسیاً ہو جائے گا(۴)

اس پرآشوب دور میں حق کی آواز بلند کرنا گویا دار و رسن کو دعوت دینا تھا لیکن اس دار و رسن کی آزمائش کے لئے ایک مرد حق بیں و دور اندیش ہندوستان کے سیاہ آلود مطلع پر نمودار ہوا وہ مرد حق پرست سر سید احمد خان تھے۔ جنہوں نے انگریزوں کو ان مظالم کی نشاندہی "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر کی۔ ان کا یہ کارنامہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور ان کی صاف گوئی اور بے باکی کا بین ثبوت بھی ہے۔

سر سید نے سب سے پہلے ہندوستان میں بسنے والے لوگوں کو متحدہ قومیت کا سبق دیا اور آپس میں ایک دوسرے کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں مدد کرنا سکھایا انہوں نے دونوں قوموں کو ایک "خوبصورت دلہن کی دو آنکھوں سے" تشبیہ دی ہے اس کے علاوہ انہوں نے گرداس پور کے ایک مخلوط جلسے کو خطاب کرتے ہوئے بہت واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

"اے ہندو اور مسلمانو کیا تم ہندوستان کے سوا کسی اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہو گے کیا اس زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاؤ گے اس پر مرتے ہو اس پر جیتے ہو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہیں ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو بھی اس ملک میں ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔"(۵)

سر سید کی تجدیدی کوششیں

سر سید ایک عالی دماغ، روشن خیال اور اولو العزم مدبر اور مصلح تھے اور ان کے پیش نظر وسیع تر اور بلند تر مقاصد تھے وہ ہندوستان کو قدیم سے جدید کی طرف لانا چاہتے تھے اور انگریزی تعلیم و تہذیب کو محض اس کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے انہیں مغرب کی کورانہ تقلید منظور نہیں تھی بلکہ وہ مغربی تہذیب کے بہترین عناصر کو ہندوستانی تہذیب میں سمو کر ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے، سیاست میں ان کی پالیسی انگریزوں کے ساتھ مشروط اتحاد عمل کی تھی جس میں ہندوستانیوں کی خودداری قائم رہے ان کی فہم و فراست کے بارے میں ڈاکٹر عابد حسین رقم طراز ہیں---

"انہیں اس تدبیر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی۔"(۶)

ان کی رائے بالعموم بڑی صائب ہوتی تھی وہ بڑے زمانہ شناس بھی تھے ان کی دوربین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستان پر پوری طرح مسلط ہو چکی ہے اور آزادی کی منزل ہم سے بہت دور جا پڑی ہے اس منزل تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہو کہ ہم اس وقت انگریزوں کے دوست بن کر رہیں۔ سر سید کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو بہتر بنانا اور ایک باعزت

۴--- مولانا مناظر احسن گیلانی، حیات قاسمی، جلد دوم ص ۹۸ بحوالہ سوانح مخطوطہ مصنفہ --- مولانا محمد قاسم (۵)--- اسباب بغاوت ہند --- سر سید احمد خان ص ۱۹ (۶)--- ڈاکٹر عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ --- ص ۲۴۹

قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کا تحفظ کرنا تھا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے جو منصوبہ بنایا اور جو حکمت عملی (تحریک) اپنائی وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھی اور سیاست، معاشرت، معیشت، مذہب، تعلیم، ثقافت غرضیکہ زندگی کے تمام اہم شعبوں کی اصلاح و ترقی اس کے دائرہ عمل میں شامل تھی۔ کام بہت مشکل تھا اور اس قدر ناموافق حالات میں کامیابی کی امید کم تھی اس لئے وہ ایک باغی اور سرفروش کی طرح اٹھے۔ طرح طرح کی مخالفیں برداشت کیں، فتوے سنے اور اپنی تعلیمی تحریک میں سرگرم عمل ہو گئے وہ جانتے تھے کہ مسلمان ترقی یافتہ اقوام کے برابر اسی وقت آسکتا ہے جب اس کے ذہن میں جدید تعلیم کی شمع روشن ہو اگر وہ لکیر کا فقیر بنا رہا تو ترقی کرنا اس کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔

ادھر انگریزوں نے ہندوستانیوں پر اپنا تسلط جمانے کے بعد اپنی تہذیب و تمدن، معاشرت اور سیاست کی جڑیں مضبوط کرنی شروع کر دیں ان کی اولین کوشش یہ تھی کہ مسلمان اپنے مذہب سے بیگانہ ہو جائیں۔ چنانچہ اعلیٰ سطح پر اس کام کی ابتدا ہوئی انگریزوں کے علاوہ اور بہت سی تحریکیں مسلمانوں کو ان کے مذہب سے دور کرنے کی جاری تھیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے

عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں اور مبلغوں کی ضرر رسانی

انگریزوں کے برسر عروج آتے ہی عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام پر رکیک حملے شروع کئے ان مشنریوں کے سامنے اس صدی کا سب سے بڑا منصوبہ ہی۔ یہی تھا کہ عیسائی پرچم کے زیر سایہ (اور بوقت ضرورت عیسائی تلواروں کے بل بوتے پر) ہندوستان سے اسلام کے اثر کو زائل کیا جائے ان مشنریوں کی سرگرمیوں سے یوں تو ہندوستان کے تمام مذاہب کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن اسلام پر ان کے حملوں کی زد بہت زیادہ تھی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"اسلام اور عیسائیت سامی الاصل مذاہب تھے اور دونوں کی بنیادی اصطلاحات کسی حد تک متحد اور باہم مانوس ہونے کے علاوہ دونوں کے عقائد اور ارکان کا معتدبہ حصہ باہم مشترک بھی تھا۔ اس لئے اوروں کے مقابلے میں مسلمانوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش زیادہ کامیاب نہ ہو سکتی تھی اس کے علاوہ یہ ایک سیاسی حربہ بھی تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے اثرات کو دور کرنے کے لئے اور اس کے دوبارہ وجود میں آنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے یہ بے حد ضروری سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے دینی اور مذہبی احساس کو جہاں تک ممکن ہو مٹا دیا جائے تاکہ دینی تنظیم کی ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی یکجہتی بھی ختم ہو جائے" (۷)

اس پر فتن دور میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کے لئے چند جانباز اور سرفروش پیدا کئے جنہوں نے ان عیسائی مبلغین کا منہ توڑ جواب دیا۔ اور اپنی تحریروں سے ان کے ہوائی قلعوں کو مسمار کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:—

"خدا نے عیسائیوں کے مقابلے کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رحم علی صاحب منگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب (چڑیا کوٹی) اور مولانا محمد علی مونگیری (سابق ناظم، ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کئے جنہوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان صاحب اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود تو رد عیسائیت کے باب میں۔ تائید غیبی سے کم نہیں اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت پادری فنڈر کے مقابلے کے لئے ڈاکٹر

۷— ڈاکٹر سید عبداللہ — سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۳۰

وزیر خاں صاحب جیسا آدمی پیدا ہوگا جو کہ عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصانیف کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو کہ عیسائیوں کو خود ان کی ہی تصنیف سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا"۔۔۔(۸)

مستشرقین کے حملوں کا منہ توڑ جواب

مسلمانوں میں مصنفین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے اسلام اور اسلامی تہذیب کی مدافعت کو اپنا شعار بنایا۔ مستشرقین کی طرف سے اسلام پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ خود ہندوستان میں سر ولیم میور نے آنحضرتؐ کی سیرت لکھی اور ان کی ذات گرامی پر رکیک حملے کئے۔ بد قسمتی سے جدید تعلیم یافتہ لوگ ان ہی کتابوں کو پڑھتے اور ان سے متاثر ہوتے۔ شبلی کی نظر اس بات پر رہی کہ جو الزامات مستشرقین یورپ کی طرف سے عائد کئے گئے ان کے جواب علمی انداز میں دیئے جائیں۔ چنانچہ ان مصنفین کا ہر مقالہ اور تمام مضامین کسی نہ کسی الزام کی تردید اور تہذیب اسلام کے کسی نہ کسی روشن پہلو کی تصویر گری ہے یا علمی انداز میں کسی الزام کی تردید ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ ان تحریروں میں معذرتی پہلو اختیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ مثبت علمی انداز میں کہا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مستشرقین یورپ جو کچھ کہتے ہیں از راہ تعصب کہتے ہیں اس لئے یورپ کی تہذیب اور یورپ کی علمی تحریک پر بھی حملے کئے گئے جن کا انداز جرأت مندانہ اور فلسفیانہ تھا۔

ہندو مذہبی تحریکیں

ایک طرف عیسائی مشنریوں کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے ہر طرف مذہبی مباحث کے دروازے کھل گئے تھے تو دوسری طرف ہندوؤں میں بھی مذہب سے متعلق نئی جستجو اور رجحان پن کی ابتدا ہوئی ان میں دو تحریکیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

★★ ۱۔ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج ۔۔۔ راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں ہندو دھرم کی قدیم روایات سے الگ ہو کر ایک نئے سلسلہ خیال کی بنیاد ڈالی وہ نئے مغربی نظام سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ہندوؤں کو اصلاحوں کی طرف مائل کیا اور ان لوگوں کے خیالات کو بدلنے کی کوشش کی جو یہ سمجھتے تھے کہ نئی تہذیب ان کے دھرم کو ناپاک کر دے گی انہوں نے بعض اصلاحات کی بھی زبردست کوشش کی، ستی کی رسم اور کم عمری کی شادی کے خلاف تحریک چلائی اور بیوہ لوگوں کی شادی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ صرف یہی نہیں انہوں نے ہندوؤں کو انگریزوں سے قریب لانے میں بھی بڑا کام انجام دیا اور ہندو مذہب میں ایک نئے فرقے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ تمام مذاہب اصلاً ایک ہیں۔

★★ ۲۔ سوامی دیانند سرسوتی کا آریہ سماج ۔۔۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پنجاب میں سوامی دیانند سرسوتی نے ہندوؤں میں جنگ جو ذہنیت اور ہندو عصبیت کی روح بیدار کرنے کی غرض سے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ ہندوئیت کی یہ نئی شکل ایک دو دھار والی تلوار سے مشابہ تھی، اس تحریک کے ذریعہ ہندوؤں کو یہ بتایا گیا کہ دنیا کی بہترین تعلیم ہندو مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف غیر ہندو مذاہب پر تنقید کے

(۸) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی۔ دیباچہ ص: ۳۰

یعنی ہندو مت کی برتری کا احساس پیدا کیا گیا اس تحریک کی زد عیسائیت کے علاوہ اسلام پر بھی پڑتی تھی اس تحریک کا رد عمل یہ ہوا کہ ہندو ہب اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں ایک مناظرہ کی صورت پیدا ہوئی۔ دین اسلام میں مناظرہ کرنے والوں کا جو حلقہ پیدا ہوا اس ں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام سرفہرست ہے انہوں نے مناظرہ کے ذریعہ تمام مذاہب پر اسلام کی فوقیت ثابت کی۔ مولانا سید سلیمان وی لکھتے ہیں۔۔۔

"آریوں کے سوامی دیانند سرسوتی کے مقابلے کے لئے خاص طور سے مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ظہور بھی تائید غیبی کا نشان ہی تھا اور ں طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور ردبدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب اور اس جماعت کے دیگر مقدس اد کے ذریعہ انجام پایا۔ اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں" (۹)

★ خود مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا پیدا ہونا

ایک بڑا خطرہ جو آئندہ اور بھی بڑھنے والا تھا خود مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا پیدا ہوتا تھا۔ جن لوگوں نظروں سے مشنریوں اور دوسرے عیسائی مصنفین یا آزاد خیال مغربی مفکروں کی کتابیں گذریں وہ اسلام کے بعض مسائل کو جو عام علماء بیان تے تھے، خلاف عقل سمجھنے لگے اور یہ ڈر تھا کہ اگرچہ وہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کریں گے لیکن مذہب سے بیگانہ ضرور ہو جائیں گے۔ اور بقول شاعر "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

سرسید خود لکھتے ہیں۔

"اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت پر نہ متوجہ ہوتا تو یقینی مذہب چھوڑ دیتا" (۱۰)

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ضرورت

مسلمانوں کا ایک طبقہ جس کی آنکھیں مغربی علوم و فنون اور تمدن کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ ہو رہی تھیں اور ان کو ہر جدید شئے اپنی طرف کھینچ لیتی تھی برصغیر کی علمی و سیاسی فضا میں ایک تصادم شروع ہو چکا تھا مغربی تہذیب اپنے پیر پھیلا رہی تھی بے شمار لوگ جدید علوم اور جدید تہذیب سے مرعوب ہو رہے تھے، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے صحیح تعلیم کی اشد ضرورت تھی ایسے نازک موقع پر چند مغربی تعلیم یافتہ جن میں سرسید احمد خان بہت اہم ہیں بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ قوم میں یہ انقلاب اسی وقت آسکتا ہے جب نئی نسل کو جدید تعلیم سے لیس کیا جائے۔

انہوں نے اپنی تعلیمی تحریک کے ذریعہ یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا وہ جانتے تھے کہ مسلمان ترقی یافتہ اقوام کے برابر اسی صورت میں سکتا ہے جب اس کے ذہن میں جدید تعلیم کی شمع روشن ہو اگر وہ لکیر کا فقیر بنا رہا تو ترقی کے سارے راستے اس پر مسدود ہو جائیں گے اور وہ اپنی اس غفلت کا کفارہ صدیوں میں بھی ادا نہیں کر پائیں گے۔

سرسید کا یہ خیال بھی تھا کہ جدید تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان اپنی شاندار روایات سے بھی بے بہرہ ہو جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ تمام جدید اور مفید علوم اور اسکے ساتھ اسلام کی صحیح تعلیمات اور زندگی کے اعلیٰ اصول

۹۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دیباچہ ص: ۱۵ (۱۰)۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، اقتباس ص: ۱۵۶

و مقاصد سے پوری طرح واقف ہو جائیں اور ملک و معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تمام اہم مسائل کو بخوبی حل کر سکیں اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی اور اپنے مقصد و نظریات کو عملی شکل دینے کے لئے علیگڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو ان کی تحریک اسلامی کا مرکز و منبع بن گیا۔

سرسید کی اصلاحی کوششیں

سرسید ایک عظیم مصنف، رہنما اور مفکر تھے، ساتھ ساتھ وہ ایک دور اندیش اور باعمل شخص تھے وہ جانتے تھے کہ آج جدید تہذیب کی جو مخالفت ہو رہی ہے وہ ہمیشہ باقی نہیں رہے گی اور ممکن ہے کہ اس کشمکش کی صورت میں مسلمان کہیں کا نہ رہے اس لئے انہوں نے فکر و عمل کی اس آویزش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مذہب کے معاملے میں ان کا نصب العین خالص علمی اور عقلی تھا انہوں نے اپنے زمانہ کے مسائل کو حل کرنے میں دین سے مدد لی اس معاملہ میں ان کا نقطۂ نظر سراسر مذہبی معلوم ہوتا ہے لیکن مذہب میں ان کو اس درجہ غلو نہ تھا جس قدر اس زمانے کے عام علماء میں تھا وہ ایک آزاد خیال، روشن دماغ اور تجدد پسند شخص تھے ان کے افکار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ قدیم کے معاملے میں جدید اور ماضی کے مقابلے میں عہد حاضر سے زیادہ وابستہ تھے۔

سرسید کو اپنے اصلاحی کاموں کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہونا پڑا، طرح طرح کی مخالفتیں برداشت کرنا پڑیں، فتوے سننے پڑے لیکن چونکہ وہ دھن کے پکے تھے انہوں نے ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہ کی اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان کا تعلیمی نقطۂ نظر جس کی بڑی شدت سے مخالفت کی گئی ہے اس قدر انقلابی نہیں تھا جس قدر اس کو پیش کیا گیا ہے انگریزی زبان کی تعلیم پر زور اور سائنس کی ترغیب ہر چند اس زمانے کے اعتبار سے بڑے انقلاب انگیز خیالات تھے۔ علماء اگر ان باتوں کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے تو یہ مناسب بات نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں علماء کو اختلاف سرسید کے مذہبی عقائد سے یا پھر انگریزی تمدن سے تھا چونکہ سرسید ان سب کے لئے کوشاں تھے اس لئے یہ الجھن پیدا ہو گئی۔

سرسید کے افکار نے ان کے زمانے کی تقریباً سبھی علمی و ادبی تحریکوں پر اثر ڈالا۔ سیاست، تاریخ، مذہب، اخلاق، اجتماعی تعلیم، سیرت غرض تمام شعبے ان کی تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہوئے، ان کی تحریری سرگرمیوں کے محور صرف دو ہیں۔ اول دینی مباحث، دوم اجتماعی مسائل، جس میں سوسائٹی کی تعلیم، اصلاح اور ترقی شامل ہے۔

سرسید کی علمی کاوشیں

سرسید اپنی علمی کاوشوں کو بروئے کار لانے کے لئے اس بات کے خواہش مند تھے کہ علوم جدیدہ کو بروئے کار لانے کے لئے اس کی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کر کے شائع کیا جائے اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک مجلس قائم کی۔ سوسائٹی نے مفید کتابوں کے ترجمے کا کام شروع کر دیا اور علمی حلقے میں اسے مقبولیت حاصل ہونے لگی، ۱۸۶۶ میں انہوں نے ان خیالات کی اشاعت کے لئے اس سوسائٹی کی طرف سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نامی ایک ہفت روزہ اخبار نکالا جو کچھ عرصہ بعد سہ روزہ ہو گیا۔ سرسید کی اصلاحی تحریک میں اس اخبار کی بڑی اہمیت تھی اور لوگوں کے خیال بدلنے اور معاشرہ کی خرابیاں دور کرنے کا احساس پیدا کرنے

میں اس نے کافی حصہ لیا، مولوی عبدالحق نے صحیح لکھا ہے

"ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی و علمی تھا اور اس کام کا ایک بڑا جزو سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا، خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا ہے جو اس وقت عمل میں آرہا تھا۔" (۱)

علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق کا اجراء بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں

"دہلی کالج کے بعد (سائنٹفک سوسائٹی) دوسرا ادارہ تھا جس نے اردو زبان میں علوم جدیدہ کو منتقل کرنے اور اسے علمی زبان بنانے کی سعی کی، سرسید اسے انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے تھے، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق بھی اس کے بچے تھے جنہوں نے ملک میں علمی ذوق اور روشن خیالی پھیلانے میں بڑا کام کیا۔" (۲)

سرسید کی مخالفت

انسانی فطرت ہے کہ ابتدا میں ہر نئی چیز کی مخالفت کی جاتی ہے لیکن جب اس چیز کا چلن عام ہو جاتا ہے تو اس سے ہم آہنگی بھی پیدا کرلی جاتی ہے۔ سرسید بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، علماء و مصنفین نے شدومد سے ان کی مخالفت کی نہ صرف ان کو وطن فروش، غدار قوم، اسلام کا دشمن بلکہ کافر و ملحد بھی گردانا گیا لیکن وہ ان الزامات سے کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے اور ان کے عزم جواں میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ ان مخالفتوں نے ان کی کوششوں کو اور مہمیز کیا، علمائے دیوبند کا پورا حلقہ ان کے خلاف کمربستہ تھا۔ یہاں کے علماء کو ہر اس بات سے اختلاف تھا جو کہ سرسید کر رہے تھے۔ سرسید کو ان علماء کی کم عقلی پر ترس آتا تھا۔

وہ اپنی تحریروں سے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور اور قومی بیداری پیدا کرکے تعلیمی و معاشرتی ڈھانچوں کو جدید تعلیم اور سائنس سے بدلنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن مذہب کو اس سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس کی روح کو مجروح اور عقائد کو پامال ہونے سے بھی بچانا چاہتے تھے۔

علی گڑھ تحریک

حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ کالج کا قیام اس ضمن میں اس قدر اہم نہیں ہے جتنا کہ وہ کام جو اس تحریک کے بانی سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے انجام دیا اور خود اس تحریک کے علمی و اصلاحی روح سے متاثر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کی حیثیت محض تعلیمی مرکز کی رہ گئی اور اس کی رہنمائی ختم ہو گئی۔ لیکن سرسید کا پیدا کیا ہوا جوش و جذبہ قید مقامی سے آزاد ہو کر پورے ملک میں پھیل گیا۔ اور اس وقت سے اس وقت تک جاری و ساری ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یہ صائب رائے ملاحظہ فرمائیے۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کی گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی فکری، علمی، سماجی، مذہبی، سیاسی اور ادبی تاریخ کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس پر سرسید اور علی گڑھ تحریک نے بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے اثرات نہ چھوڑے ہوں۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے لئے مدرستہ العلوم ایک تعلیمی درسگاہ، نئے فکری رجحانات کی ایک علامت، احیاء ملی کی ایک تحریک کا نام تھا۔ یہاں "آدم گری" بھی ہوتی تھی اور تعمیر ملت کا سامان بھی

۱۔۔۔ مولوی عبدالحق ۔۔۔ رسالہ اردو: جولائی ۱۹۳۰ء (۲) ۔۔۔ مولوی عبدالحق ۔۔۔ خطبات عبدالحق ص ۳۲

مہیا کیا جاتا تھا۔ یہاں وقت کے اشاروں پر کو سمجھنا بھی سکھایا جاتا تھا اور اس کے دھاروں کو موڑنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جاتی تھی، سر سید کی بلند حوصلگی، عزم راسخ، خلوص نیت اور جہد مسلسل نے اس مشکل اور متنوع کام کو ایک تحریک کی شکل دے دی تھی۔ زمانے کے پیچ و خم کے ساتھ تحریک کے خد و خال بھی بدلتے رہے لیکن سر سید کے افکار کی معنویت ہر دور کے لئے بڑھتی ہی رہی ''۔(۱۳)

سر سید کی اس علمی و ادبی تحریک نے ہمارے رجحانات کو یکسر بدل دیا۔ اور ایک ایسے علمی مذاق کی بنیاد ڈالی جس میں حقیقت و صداقت کی جستجو تھی، سچائی کی تلاش اور تکمیل زندگی و ترقی۔ یہ وہ اہم بنیادیں ہیں جن پر سر سید کے تمام علمی کاموں کی بنیاد کھڑی ہے۔

افکار کے لحاظ سے علی گڑھ تحریک کا اس انقلاب میں بڑا حصہ ہے، جو انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں نمایاں طور پر رونما ہوا ان میں حال سے دلچسپی، مادی مسائل، زندگی سے لگاؤ، جدت پسندی اور روایت سے بغاوت کا رجحان خاص طور سے قابل ذکر ہیں ملی و ملکی ترقی کا خیال اور ماضی کے مقابلہ میں مستقبل کی اہمیت کا احساس بھی علی گڑھ تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

ضرورت ہے کہ موجودہ نسلیں سر سید کے پیغام اور افکار کی روح کو سمجھیں اور پوری طرح خود اعتمادی، عزم اور خلوص نیت کے ساتھ ان کی تحریک کو آگے بڑھائیں۔ سر سید کے سامنے محدود اور وقتی طلبیں نہیں تھیں انہوں نے لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا۔

''اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔ ''(۱۴)

ادبی لحاظ سے بھی علی گڑھ تحریک کے اثرات بہت وسیع اور دور رس ہیں، نہ صرف اسلوب بیان اور روح مضمون بلکہ اصناف ادب میں بھی اس کی توسیعی کوششوں نے بڑا کام کیا، ادبی نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک ہی سے جدید اردو ادب کا آغاز ہوتا ہے۔ سر سید اور ان کے ساتھیوں نے مقفیٰ و مسجع اردو نثر کو ختم کر کے سلیس و سادہ نثر کو رواج دیا، مولانا شبلی نعمانی جنہیں لوگ بڑے طمطراق سے سر سید کا مخالف قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

''سر سید کے جس قدر کارنامے ہیں۔ اگرچہ (ان میں) ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سر سید کی بدولت اردو آج اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر وسعت و جامعیت، سادگی و صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو سر سید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں بعض نے دور سے فیض اٹھایا، بعض نے مدعیانہ اپنا راستہ الگ نکالا تاہم سر سید کی فیض پذیری سے مبرا کیوں کر رہ سکتے تھے۔ ''(۱۵)

نئی اردو شاعری اور تنقید کی ابتدا کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے سر ہے حالی کے علاوہ سر سید اور ان کے رفقاء نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اس لئے علی گڑھ تحریک کو خالصتاً مذہبی تحریک نہیں کہا جا سکتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک تعلیمی، ادبی اور مذہبی تحریک تھی جس کا مقصد قوم کو پستی سے نکال کر اس مقام تک لانا تھا جہاں وہ دنیا کی دوسری اقوام کے سامنے کھڑی ہو سکے۔

---

(۱۳) ۔۔۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی سر سید اور علی گڑھ تحریک ۔۔۔ ص ۳ (۱۴) ۔۔۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی سر سید اور علی گڑھ تحریک ۔۔۔ ص ۴ (۱۵) ۔۔۔ مقالات شبلی، جلد دوم ص ۵۷

سر سید اور ان کے رفقاء

سر سید اپنی ذات سے ایک انجمن تو تھے ہی، علمی اعتبار سے ان کی حیثیت ایک ادارہ سے کم نہ تھی۔ سر سید ہندوستان کے ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جن کو اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا ایک مخلص حلقہ مل گیا تھا۔ جنہوں نے اپنے افکار اور تحریروں کے ذریعے عملاً ان کا ساتھ دیا اس حلقے میں یوں تو بہت سے نام ہیں لیکن نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس تحریک نے اسلوب بیان اور روح مضمون کے علاوہ اصناف ادب کی توسیع میں بھی بڑا کام کیا اور بعض ایسی اصناف ادب کو رواج دیا جو اس سے قبل ہمارے ادب میں نہیں تھیں اور مغرب سے حاصل کی گئی تھیں۔

اردو میں تنقید کی ابتدا صحیح معنوں میں سر سید اور ان کے رفقاء سے ہوئی ہے، سر سید کی بیشتر تنقیدیں مذہبی اور سماجی حالات پر تھیں۔ شبلی اور حالی نے ادبی تنقید کے معیار کو بلند کیا۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اس معیار کو بلند تر کرنے کی کوشش کی اور شبلی نے شعر العجم لکھنے کی ابتدا اسی خیال کو سامنے رکھ کر کی۔

اس کے بعد سوانح نگاری کا نمبر آتا ہے۔ سر سید کے خطبات احمدیہ کے بعد حالی و شبلی نے اس فن کو بہت وسعت دی، حالی نے حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب اور شبلی نے المامون، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی لکھ کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہاں پر یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ المامون، سیرۃ النعمان اور الفاروق لکھتے وقت شبلی پر جو جذبہ طاری تھا وہ آگے چل کر دار المصنفین کی صورت میں زیادہ ابھرا۔ ناول نگاری کی ابتدا بھی اس دور سے ہوئی۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں سے زندگی کے بعض مسائل کی ترجمانی کے ذریعے ادب زندگی میں رابطہ قائم کیا۔ تاریخ نگاری کا علمی انداز بھی اردو میں اس دور سے شروع ہوا، شبلی و ذکاء اللہ اس دور کے اہم مورخ ہیں، مقالہ نگاری کے فن کی ابتدا بھی در حقیقت اسی دور سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فن ہمارے ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ سر سید، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، شرر، حالی اور شبلی اس دور کے ممتاز مقالہ نگار تھے ان کے مقالے اردو ادب میں بلند مرتبے کے حامل ہیں۔

سر سید اور شبلی

سر سید کے تمام رفقاء بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے ان میں سے ہر فرد ایک ادبی ریاست کا فرمانروا تھا لیکن شبلی ان میں سب سے فعال اور متحرک تھے، سر سید کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے بڑے ہمدرد تھے لیکن ہر معاملے میں اپنی ذاتی رائے بھی رکھتے تھے اور دوسروں کی رائے سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے رفقاء کی طرح سر سید کا ساتھ بہت دنوں تک نہ دے سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کا نصب العین ایک تھا۔ مگر نقطۂ نگاہ میں بہت بعد تھا سر سید کو حال و مستقبل سے دلچسپی تھی۔ شبلی کو حال و مستقبل کے ساتھ ماضی سے بھی لگاؤ تھا، رجحان کے اس اختلاف نے شبلی کو سر سید سے الگ ہونے پر مجبور کیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے لفظاً لفظاً صائب ہے وہ لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی کی فکری تاریخ میں ہمیں صرف دو بزرگ نظر آتے ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے زمانے کے سربرآوردہ، منفرد اور یکتا شخص تھے ایک سرسید اور دوسرے شبلی اتفاق کی بات ہے اور اسے حسن اتفاق سمجھئے کہ شبلی اور سرسید دونوں مقاصد میں ہم آہنگ تھے۔ اگرچہ زاویہ نظر میں دونوں کا اختلاف تھا، سرسید اپنے زمانہ کے حالات، اپنے زمانہ کی تہذیب اور اپنے زمانہ کے علوم سے مفاہمت کے قائل تھے اور شبلی مفاہمت کے بجائے مقابلہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔

۱۸۵۷ کے بعد مسلمانان ہند کی جو حالت ہوئی اس سے متاثر ہوکر سرسید نے ہر شعبہ میں مفاہمت اختیار کی، تعلیم و تہذیب کے میدان میں بھی مفاہمت ہی ان کا اصول تھا اس طرح دینی فکر میں بھی انہوں نے مفاہمت کو اپنے مد نظر رکھا اسے کوئی اچھا یا برا کہے لیکن اپنے زمانہ کے حالات کے تحت سرسید نے نیک نیتی سے مفاہمت ہی میں مسلمانوں کی بہتری خیال کی اور اس پر قائم رہے اس کے اچھے نتائج بھی نکلے اور برے بھی لیکن آج اچھے اثرات ہی کا ذکر کرنا چاہئے کیونکہ ساری چیز خلوص اور نیک نیتی ہی سے کی گئی۔

ان کے برعکس شبلی مذکورہ بالا مفاہمت کے بجائے مقابلہ کے اصول میں اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ وقت کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے لیکن اس کے ساتھ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ محض مفاہمت کوئی چیز نہیں، ترقی بھی لازمی ہے۔ وہ کہتے تھے اس پرانی دعوت کو جسے اسلام کہتے ہیں اور اس روایت کو جسے اسلام نے پیدا کیا آگے بڑھانا ضروری ہے۔ وقت کے چیلنج کو قبول کرنے کا مطلب جھک جانا نہیں بلکہ دوسروں کے افکار کو سمجھ کر ان کا مقابلہ کرنا اور ان کے مقابلے کے لئے ہتھیار تیار کرنا تھا۔ شبلی اسی اصول پر قائم تھے۔

شبلی ایسے مستقبل پر نظر رکھتے تھے جو ماضی سے ہم آہنگ ہو لیکن سرسید محض مستقبل پر نظر رکھتے تھے۔ وہ روایت کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے ان کے خیال میں ہر زمانہ اپنی روایات خود پیدا کرتا ہے شبلی کے نزدیک روایت اور روایات ملی تاریخ سے بطور ورثہ منتقل ہوتی ہیں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ترقی کا ہر قدم ماضی کی اساس پر ہونا چاہئے، انہوں نے فرمایا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ آگے بڑھو، میں کہتا ہوں پیچھے ہٹو اور اتنا ہٹتے جاؤ کہ صحابہ کے زمانہ میں پہنچ جاؤ اور اس سے بھی اور پیچھے آں حضرت کے زمانہ میں پہنچ جاؤ"۔ پیچھے کی طرف ہٹنے سے مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدا کی ہوئی فضاء تک پہنچنا تھا۔ اور اس روح تک پہنچنا تھا جو آنحضرت نے پیدا کی اس کے لئے ضروری تھا پیچھے کی طرف ہٹا جائے اور پیچھے کی طرف ہٹ کر آگے کا مستقبل کا منصوبہ پچھلے دور کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔ یہ شبلی کے خیالات تھے اور ظاہر ہے کہ ان خیالات میں سرسید اور شبلی کے مابین اتفاق ہونا ممکن نہیں تھا۔ آج بھی ان مسئلوں میں اتفاق نہیں ان میں کچھ۔ تو ہوسکتا ہے لیکن اتفاق رائے ممکن نہیں۔ گویا سرسید اور شبلی کا اختلاف ذہنی اور اصولی تھا۔" (۱۶)

شبلی کسی مسئلہ سے متعلق جو رائے قائم کرلیا کرتے تھے اس کو اس وقت تک نہیں بدلتے تھے جب تک کہ وہ مطمئن نہ ہوجائیں۔ سرسید سے اول تو تعلیمی مسئلہ میں ان کا اختلاف ہوا، سرسید کے نزدیک ہندوستانیوں کی تعلیم انگریزی ہی کے ذریعہ ممکن تھی کیونکہ انگریزی اس وقت سکہ رائج الوقت تھی۔ مولانا شبلی کا اس کے برعکس یہ خیال تھا کہ ملکی زبانوں کے ذریعہ بھی علوم و فنون کی ترقی

۱۶۔۔۔ڈاکٹر محمد عبداللہ۔ شبلی۔ ایک جامع الحیثیات شخصیت (مقالہ) مقالات یوم شبلی ۱۹۶۸ ص ۱۰ تا ۱۲

ممکن ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی قوم اپنی زبان کو علوم و فنون کی زبان بنانا چاہتی ہے تو اس کو چاہیے کہ پہلے اپنی زبان کو حکمراں زبان بنالے اور آج کے واقعات کی روشنی میں ہماری زبان بننے کی کوشش کر رہی ہے اور علوم و فنون کے خزانوں سے مالا مال ہے۔

سرسید نے سیاسی اور تعلیمی مفاہمت کو اپنی پالیسی کے طور پر اختیار کیا اور مسلمانوں کے اکثر امراض کے علاج کیلئے جدید تعلیم کے حصول کو ضروری قرار دیا۔ علامہ شبلی مدرسہ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے لیکن اس یک سمتی اور یک رخی کو طبعاً اختیار نہیں کر سکتے تھے جو اکابرین دیوبند کا خاصہ تھی۔ انہوں نے دیوبند کے بجائے سرسید کے ساتھ تعاون کرنا مناسب سمجھا۔

سرسید کی وفات کے بعد انہوں نے علی گڑھ کالج سے لاتعلقی اختیار کر لی اور اپنا ایک راستہ متعین کیا جس کے تین پہلو تھے۔

(۱) ایک ایسے تعلیمی مرکز کا قیام جس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور اس کے ذریعہ جدید علوم کی تعلیم کا بھی انتظام ہو۔

(۲) تصنیف و تالیف کے ذریعہ مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا جائے۔

(۳) ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو بے لوث اور بے غرض مولفوں اور مصنفوں کے لئے تصنیف و تالیف کی سہولتیں مہیا کرے۔

دوسرا سبب مذہبی اختلاف تھا، سرسید مذہب کے معاملہ میں آزاد خیال تھے جب کہ شبلی مذہب کے دائرہ سے ایک قدم ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:—

''مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں اور دوسرے (مولانا شبلی نعمانی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد کی حفاظت اور بقاء کے ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔'' (۱۷)

مولانا شبلی کی تصنیفی زندگی کا آغاز تو ۱۸۸۷ء میں ہو چکا تھا ان کا سب سے پہلا مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' علی گڑھ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا اس کی تیاری میں جدید و قدیم علوم کی کم و بیش یک صد کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا یہ مقالہ عمومی طور پر بہت پسند کیا گیا۔ شبلی چونکہ اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہن کو بیدار کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنا موضوع ''ان مسلم ہیروز'' کو رکھا تھا جنہوں نے اپنے فکر و عمل سے اسلامی زندگی میں جان ڈال دی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی معرکتہ الآرا تصانیف المامون، النعمان، الفاروق وغیرہ ہیں۔

مولانا شبلی کی تصنیفی زندگی کا آغاز علی گڑھ میں ''المامون'' سے ہوا۔ اس کا دیباچہ سید احمد خان نے لکھا اس دیباچہ کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست، مخدوم اور ہمارے مدرستہ العلوم کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ایک سلسلہ ''ہیروز آف اسلام'' کا لکھنا چاہا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک یہ کتاب ہے۔ جو المامون کے نام سے موسوم ہے۔ انہوں نے خلفائے بنی عباس میں سے مامون رشید بن ہارون رشید کو عباسی خلفاء کا ہیرو قرار دیا اور اس کے تمام کارنامے اچھے یا برے نہایت خوش اسلوبی اور خوبی سے اس میں لکھے ہیں۔

۱۷— حیات شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی ص ۱۹۰

اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور منظم اسلوب سے ایک جگہ جمع کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ مصنف نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر ماخذ سے سے نہ دیا ہو۔ ہر ایک جزوی بات پر بھی اس کتاب کا جس سے وہ بات لی گئی ہے حوالہ دیا گیا اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جان کاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزار ورق تاریخوں کے الٹنے پڑے ہوں گے اور اس کے ساتھ جب یہ خیال کیا جائے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کر کے جس کی نسبت خیال بھی ہوتا تھا کہ ان میں مامون کے حالات ہونے کے تو اس محنت کی وسعت اور قدر بھی زیادہ ہو جاتی۔

یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی اور ایسے صاف اور شستہ برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔۔۔

اس کتاب کا حق تصنیف مصنف نے اپنی فیاضی اور قومی ہمدردی سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ عطا کیا۔ (۱۸)

سید احمد خان، سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۹ (دوسرے ایڈیشن کا مقدمہ)

اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور چند سالوں میں اس کتاب کے سات ایڈیشن شائع ہوئے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ اس کی رائلٹی سے مستفید ہوا

المامون کے بعد مولانا شبلی نے سرسید کے سامنے جب ''الفاروق'' لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے اس کو پسند نہ فرمایا، ناپسندیدگی کی اصل وجہ کالج کی مصلحت بھی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کی اشاعت ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سنی اور شیعی کا فرق پیدا کر دے، سرسید کو سب سے بڑا خطرہ نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کا تھا وہ کالج کے بڑے ہمدردوں میں تھے۔ سرسید کا خیال تھا کہ یہ کتاب ان سے ناراضگی کا سبب بن سکتی ہے سرسید نے اپنے ایک خط میں نواب عمادالملک کو بھی اس سلسلے میں لکھا تھا اور انہوں نے ان کو جواب دیا کہ

''اسلام میں دین و دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہے۔ لہذا ان کی سوانح لکھنے سے مولانا شبلی کو نہ روکا جائے''۔ (۱۹)

آخر کار مولانا شبلی نے الفاروق لکھی اور خوب لکھی اس تصنیف میں وہ تحقیق کے اعلیٰ درجہ پر نظر آتے ہیں مولانا شبلی ''الفاروق'' کو اپنی عمر کا سرمایہ سمجھتے تھے اور اس پر انہیں متعدد اعتبارات سے بجا طور پر ناز تھا اور واقعتاً الفاروق ہماری زبان کا ایک تاریخی شاہکار ہے

مولانا شبلی کی علیگڈھ سے علاحدگی

سرسید کے تمام رفقاء میں مولانا شبلی حریت فکر اور سیاسی آزادی کے علمبردار تھے، وہ سیماب صفت شخصیت تھے۔ طبیعت میں بغاوت کا عنصر بھی شامل تھا اس بغاوت کی ابتدا والد کے نظریات کی مخالفت اور ترک وطن سے شروع ہوئی۔ علی گڈھ میں سرسید سے اختلافات کی شکل میں رونما ہوئی۔ پھر حیدرآباد و لکھنؤ میں ندوۃ العلماء سے ترک تعلق اور دارالمصنفین کے قیام تک یہی عنصر غالب نظر آتا ہے۔

مولانا شبلی نے سرسید کے انتقال کے بعد اور مختلف قسم کے مذہبی، سیاسی اور تعلیمی اختلافات کے بعد علی گڈھ کو خیرآباد کہا۔ ۱۹۰۱

۱۸--- مولانا شبلی نعمانی۔ المامون۔ مقدمہ سرسید احمد خان دوسرا ایڈیشن از سرسید احمد خان، سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڈھ ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۹ (۹) --- حیات شبلی مرتبہ۔ سید سلیمان ندوی ص ۹۰

میں وہ حیدر آباد گئے جہاں ان کو سر رشتۂ علوم و فنون کی نظامت کا عہدہ تفویض ہوا۔ یہاں ان کو تصنیف و تالیف کا بہتر موقع ملا۔ اور یہیں انہوں نے الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کی کچھ جلدیں لکھیں ان کی یہ علمی ادبی سرگرمیاں اس منزل کی نشاندہی کر رہی تھیں جو بعد میں دار المصنفین کی صورت میں ابھریں۔

شبلی ایک صاحب نظر تھے اور بزرگان وقت کی جی حضوری نہیں کر سکتے تھے اپنی ایک صائب رائے رکھتے تھے اور وہی کرتے تھے جسے وہ پسند فرماتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صحیح طور پر ان کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

''رفقائے سر سید میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو سر سید سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی بھی ہے۔ شبلی کا درجۂ عقل پسندی کی تحریک میں وہی ہے۔ جو معتزلہ اور متکلمین میں امام ابوالحسن الاشعری کا ہے۔ شبلی نے سر سید کی ہمہ گیر عقل پسندی کو معتدل بنانے کی کوشش کی اور عقل و وجدان کے درمیان ایک معقول رابطہ پیدا کرنے کی سعی کی۔''۔(۲۰)

ندوۃ العلماء کی تحریک

ندوۃ العلماء کی تحریک ایک سنجیدہ، ہمہ گیر اور صالح علمی و اصلاحی تحریک تھی جس نے ایک طرف مسلمانوں کی فکری اور علمی زندگی میں اور دوسری طرف تعلیم و تربیت میں دور رس نتائج و اثرات پیدا کئے افسوس کہ ہمارے تعلیمی ادارے ابھی تک علمی جامعیت، قدیم و جدید کے امتزاج اور اصلاح و تجدید کے نصاب کے اس اعلیٰ نصب العین تک نہیں پہنچ سکے جس کے بانی علامہ شبلی تھے۔ اگر مسلمان اس تحریک کا عملی طور پر خیر مقدم کرتے اور اسے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیتے تو مادہ و روح، دنیا و دین، اور جدید و قدیم میں وہ بعد و تفاوت ظہور میں نہ آتا، اور مسلمانوں کی زمام کار دین دار طبقہ کے ہاتھ سے نکل کر لادین طبقہ کے ہاتھ میں نہ جاتی۔

علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء

علامہ شبلی نے محسوس کیا کہ ایک طرف دیوبند کا قدیم مدرسہ ہے جو مذہبی علوم اور روحانی اقدار کی سرپرستی تو کر رہا ہے مگر تقلیدی رسوم و خیالات پر سختی کے ساتھ جما ہوا ہے عصر جدید کے تقاضوں اور علوم و فنون پر اس کی نظر نہیں دوسرے علی گڑھ کا دار العلوم ہے اس مدرستہ العلوم میں جدید علوم و فنون اور عصر نو کے تقاضوں کی تکمیل کے سامان تو پیدا ہو گئے ہیں مگر یہاں کے فارغ التحصیل اسلامی تعلیم اور دینی آداب سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ انہوں نے دونوں قدیم و جدید درسگاہوں میں برسوں رہ کر اکتساب فیض کیا تھا لہٰذا انہیں شدت سے احساس ہوا کہ کوئی ایسا مدرسہ قائم کیا جائے، جہاں قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہو یعنی ایک ایسا مرکز ہو جو علی گڑھ اور دیوبند کا مجموعہ ہو جسے صحیح معنوں میں مجمع البحرین کہا جا سکے ۱۸۹۴ میں جب ندوۃ العلماء قائم ہوا تو وہ ان کی تمنا کے عین مطابق تھا اس لئے انہوں نہ صرف اس صدا پر لبیک کہا بلکہ وہ اس وقت سے ان کی زندگی کا عین مقصد بن گیا اسی لئے وہ ۱۹۰۵ میں حیدر آباد سے مستعفی ہو کر ندوۃ آئے تو ان کی آمد اور قیام سے طلبہ و اساتذہ میں بڑی خوشی منائی گئی۔ مولانا اپریل ۱۹۰۵ میں ندوۃ کے باقاعدہ معتمد منتخب ہوئے اور ۱۹۱۳ تک اس عہدہ پر فائز

۲۰۔۔۔ حیات شبلی۔ مرتبہ سید سلیمان ندوی ص ۴۳۹، ۴۴۰

رہے اس عہدے کو سنبھالنے کے بعد انہوں نے عربی تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح کا کام شروع کیا، جدید نصاب تعلیم کا جو ہر طرح سے وقت کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ اجراء کیا، انگریزی، ہندی اور سنسکرت کی تعلیم جاری کی تاکہ مسلمان ان زبانوں کو پڑھ کر عیسائی مشنریوں اور دوسری تحریکوں کا مقابلہ کر سکیں۔ جدید عربی کی تعلیم شروع کی۔ تحریر و تقریر کی مشق کی طرف توجہ کی تاکہ مقررین اور مصنفین پیدا کئے جا سکیں۔ لائق مدرسین کی فراہمی پر زور دیا، درجہ اعلیٰ و درجہ تکمیل جاری کئے۔ علوم جدیدہ کی تعلیم مثلاً سائنس فلسفہ ریاضیات وغیرہ نصاب میں داخل کئے گئے۔ ایک عمدہ قسم کی لائبریری کی طرف خاص طور سے توجہ کی گئی اور ایک علمی ماہنامہ رسالہ "الندوہ" کا اجراء کیا۔ الندوہ کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علماء اور قارئین پر بہت پڑا۔ شبلی کی اس تحریک کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ لکھنے والوں کا ایک لائق گروہ پیدا ہو گیا جس میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ضیاء الحسن علوی، خواجہ عبدالواحد ندوی، مولوی اکرام اللہ خان ندوی، مولوی عبدالرحمان نگرامی، مولوی قمرالدین وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان اصلاحات کا یہ نتیجہ نکلا کہ ندوۃ العلماء کے تلامذہ فلسفہ اور سائنس کے بعض شعبوں میں ماہر و صاحب تصنیف ہونے کے بعد اس قابل ہوئے کہ انہوں نے ان علوم کو دین کا خادم بنا دیا اور بتایا کہ ایک فلسفی اور سائنس داں حد اتر کی مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور فلسفہ و سائنس دین حق کی علمیہ کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنی تعلیم میں علم آموزی اور ذوق تعلیم کا اہتمام کتاب آموزی سے زیادہ کر دیا اور تربیت کا ایسا انتظام کیا کہ طلباء میں حوصلہ اور بلند نظری پیدا ہو گئی مگر اس انداز میں کہ دینی اقدار سے رشتہ نہ ٹوٹنے پائے اور ساتھ ہی ساتھ مندرجہ بالا صاحب قلم علماء بھی پیدا ہوئے کہ جن کی تصانیف نے علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

ندوۃ العلماء میں مولانا شبلی کی مخالفت کا دور

مولانا شبلی نے ندوہ کے کام کو اپنی زندگی کا مشن بنایا تھا اور اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جا رہی تھی اور اس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بنتا جاتا تھا بقول سید سلیمان ندوی

"ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی"۔(۴۱)

مولانا کی یہ شہرت اگرچہ کچھ لوگوں کے لئے باعث طمانیت تھی تو کچھ لوگوں کے لئے باعث رشک و حسد بھی اور اسی رشک و حسد نے مولانا کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا۔ مولانا کی مخالفت کا دوسرا سبب ان کی علی گڑھ تحریک سے وابستگی تھی، علماء کا وہ طبقہ جو مذہبی امور میں کٹر تھا اور مولانا کی طرح روشن خیال نہ تھا ان کو مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا ان کا خیال تھا کہ یہ اصلاً علی گڑھ تحریک کے آدمی ہیں اور علی گڑھ چھوڑ کر ندوہ میں اسی لئے شریک ہوئے ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو نقصان پہنچائیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا علی گڑھ تحریک سے وابستگی کے باوجود اس کے بعض حصوں سے جن کا ذکر قبل کیا جا چکا ہے۔ شدید اختلافات رکھتے تھے اور اس بناء پر وہ ندوہ میں شامل ہوئے تھے۔ مولانا کے مخالفین ندوہ میں ان ترقی یافتہ اصلاحی کاموں کے شدت سے مخالف تھے۔ جنہیں انہوں نے انتہائی جرأت سے شروع کیا تھا۔

تیسرا سبب یہ بھی تھا کہ مولانا قدامت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے بھی علمبردار تھے اور روایتی قسم کے مولوی نہ تھے اس لئے عام علماء کی نظروں میں وہ کھٹکتے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے بھی اس کا اظہار یوں کیا ہے

۴۱۔۔۔ حیات شبلی مرتبہ۔۔۔ سید سلیمان ندوی ۶۲۹۔۔۔۶۳۰

"پھر اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقاء اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا اور اس لئے ان علماء کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے، مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا، اور اسی بناء پر وہ طلبہ کے لئے ان کی تعلیم و صحبت کو سخت مضر سمجھتے تھے۔" (۴۲)

اس کے علاوہ مولانا کی دو کتابیں علم الکلام اور الکلام بعض علماء کے نزدیک قابل اعتراض تھیں ان کے بعض مباحث مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے ان علماء کی ایک جماعت جو متکلمین کی آراء و تحقیقات سے بے خبر تھی ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لئے ان کو موزوں نہیں سمجھتی تھی۔

انہیں اسباب کے پیش نظر مولانا کے خلاف مختلف قسم کے ہنگامے برپا کئے گئے اور وہ ان ہنگاموں سے بددل ہو کر دار العلوم کی معتمدی سے جولائی ۱۹۱۳ء میں مستعفی ہو گئے، مولانا کے استعفیٰ کا یہ اثر ہوا کہ ندوہ کے دوسرے مخلصین اور معتمدین یعنی مولوی سید عبد الحیٔ اور منشی احتشام علی نے بھی اپنے استعفیٰ دے دیئے، بعض دوسرے اراکین نے بھی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا، مولانا کے استعفیٰ کی خبر سے طلباء کو سخت افسوس ہوا اور ان سے استعفیٰ واپس لینے کی التجائیں کی گئیں لیکن انہوں نے عہدہ ذمہ داری لینے سے انکار کیا لیکن ایک معمولی رکن کی حیثیت سے اب بھی ان کی زندگی کا مقصد ندوہ کی خدمت رہا۔ اس قدر مخالفت کے باوجود وہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک اس ادارہ کے بھی خواہ رہے، اگست ۱۹۱۳ء کو مولوی مسعود علی ندوی کو بمبئی سے خط لکھا

"ندوہ سے تعلق منقطع ہو نا محال ہے لیکن وہیں آ کر یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو"۔ (۴۳)

اصلاح ندوہ تحریک

مولانا شبلی نے ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد اس کے علاج سے مایوس ہونے کے بجائے اصلاح ندوہ کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اسی مقصد کے پیش نظر اپریل ۱۹۱۴ء کی ابتداء میں "مجلس اصلاح ندوہ" کا قیام عمل میں آیا، مخالفین نے اس اصلاحی تحریک کو ناکام بنانے کے لئے جو آخری حربہ استعمال کیا وہ مولانا کی تکفیر کا فتویٰ تھا۔ مولانا کی تصانیف "الکلام" اور "علم الکلام" کی بعض عبارتوں کی بناء پر تکفیر کا یہ فتوی مرتب کیا گیا جس میں ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ قدم مادہ کے قائل ہیں اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں۔ مولانا نے اس کے جواب میں ایک مفصل بیان لکھا تھا:—

"میں مادہ عالم کو قدیم نہیں مانتا۔ البتہ تمام صفات الٰہی کے قدم کا قائل ہوں اور اسی طرح نبوت کو بھی اکتسابی نہیں مانتا بلکہ اس کو عطیۂ الٰہی مانتا ہوں"۔ (۴۴)

مولانا کی زندگی میں ان کے موافقین کی آخر وقت تک یہ کوشش رہی کہ مصالحت کی کوئی صورت نظر آئے لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ فریقین میں یہ مصالحت مئی ۱۹۱۵ء میں ہو سکی جب کہ تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا لیکن یہ اسی وقت ہوا جب مولانا دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار چکے تھے۔ ندوہ سے مولانا کی علاحدگی یوں تو ایک ناخوشگوار واقعہ تھی لیکن علم و ادب کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی ندوہ سے علاحدگی کے بعد ان کے ذہن میں ایک دار المصنفین کا تخیل پیدا ہوا اور وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں لگ گئے۔

۴۲— حیات شبلی مرتبہ — سید سلیمان ندوی ص ۶۴۰ (۴۳) — مکاتب شبلی، حصہ دوم از شبلی نعمانی مکتوب بنام مولوی مسعود علی ندوی ص ۱۹۰

ہندوستان میں فارسی کا تہذیبی ورثہ

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
(شعبۂ فارسی ـ دہلی یونیورسٹی ـ دہلی)

قرون وسطٰی میں فارسی ہندوستان کی ادبی زبان بھی رہی ہے اور تہذیبی و ثقافتی زبان بھی۔ اس دور میں ہندوستانی ادب کی اگر کسی زبان نے مکمل طور پر نمائندگی کی ہے تو وہ فارسی زبان ہے۔ قرون وسطٰی کے ہندوستان میں مختلف علوم، فنون لطیفہ اور حتی مذاہب و ادیان کا اگر مفصل جائزہ لینا ہے تو فارسی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ دلچسپ، اہم اور تاریخی حقیقت بھی ہم سے پوشیدہ نہیں کہ سنسکرت کی بعض ایسی کتابوں کو جنہیں ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے، اگر کسی زبان نے سب سے پہلے ہندوستان سے باہر متعارف کرایا ہے تو وہ فارسی زبان ہے۔ اس ضمن میں پنچ تنتر کی مثال دی جا سکتی ہے۔ قرون وسطٰی کا عوامی ادب جس قدر وسیع پیمانے پر فارسی زبان میں محفوظ ہے، غالباً ہندوستان کی دوسری زبان مشکل ہی سے اس امتیاز کا دعوی کر سکتی ہے۔ عوامی ادب سے یہاں میری مراد کہانیوں، قصوں، داستانوں وغیرہ سے ہے تو ہمارے عظیم ملک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رائج تھیں اور جن کے بے پناہ چلن کی وجہ سے ہندوستان کو داستانوں کا ملک کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک کا شاید ہی کوئی ایسا چھوٹا یا بڑا علاقہ ہوگا جہاں کی مختصر یا مفصل تاریخ فارسی زبان میں نہ لکھی گئی ہو۔ الغرض قرون وسطٰی کے ہندوستان پر فارسی کے احسانات کا جائزہ لینا وہ طویل اور پتہ مارنے کا کام ہے جس کی اس وقت مہلت نہیں۔

فارسی ایک زبان ہے، یہ صحیح ہے، تاریخی حقیقت ہے، لیکن فارسی ایک تہذیب بھی ہے۔ ایک ثقافت کا نام بھی ہے جس کی عظمت و وسعت کا بارہا اعتراف کیا جا چکا ہے۔

قرون وسطٰی میں فارسی دربار کی زبان تھی۔ دربار کا بیشتر کاروبار اسی زبان میں انجام دیا جاتا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہندوستان کے عظیم و پرشکوہ درباروں کے سربراہ یعنی سلاطین و شہنشاہ کی زبان فارسی تھی؟ اس کا جواب بالکل سادہ اور واضح ہے کہ نہیں، ان سلاطین و بادشاہوں کی مادری زبان فارسی نہیں تھی؟ سلاطین دہلی کا سب سے پہلا شاہی خاندان ترک تھا، اس کے بعد خلجی، پھر تغلق، سید اور لودھی اور اس کے بعد مغل یہ سب غیر ایرانی تھے۔ ان کی زبان بھی فارسی نہیں تھی۔ ان میں سے بیشتر شاہی خاندانوں کی مادری زبان ترکی تھی۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب حکمرانوں کے دربار میں ترکی کو سرکاری یا درباری زبان کا درجہ کیوں نہیں دیا گیا۔ فارسی کو درباری زبان کے طور پر کیوں اختیار کیا گیا؟ اس موضوع پر طول طویل بحث کی جا سکتی ہے، لیکن یہ فی الحال ہمارے احاطۂ موضوع سے خارج ہے اس لئے صرف اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی ایک اہم اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ قرون وسطٰی کے یہ حاکم و سربراہ یہ جانتے تھے کہ فارسی محض ایک زبان کا نام نہیں بلکہ یہ ایک تہذیب کی نمائندہ ہے اور فارسی جو خود ایک تہذیب کا نام بھی

ہے۔ جس کی عظیم اور بین الاقوامی روایات کے سامنے حتی عرب فاتحین نے بھی سر جھکا دیا تھا۔ قرون وسطی کے ہندوستانی درباروں پر نگاہ ڈالیے یہ سب انہی پر شکوہ فارسی روایات میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے۔ فارسی تہذیب کی ایک امتیازی شان جس کی وجہ سے قرون وسطی میں ہندوستان کے درباروں اور سماج کے دوسرے طبقوں نے اسے سر آنکھوں پر جگہ دی، اس کی آفاقیت تھی۔ یہ تہذیب بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے لئے قابل قبول تھی۔ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی زبان مبارک سے نکلا ہوا یہ فقرہ "ہر قوم راست راہی، دینی و قبلہ گاہی" اس تہذیب کی بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ انسان دوستی پر منحصر اس فارسی تہذیب کو کون گلے نہ لگاتا جس کی فضا میں سعدی شیرازی کے یہ افکار گونج رہے تھے۔

بنی آدم اعضای یک دیگر اند :: کہ در آفرینش زیک گوہر ند
چو عضوی بدرد آورد روزگار : دگر عضوہا را نماند قرار
توکز محنت دیگران بی غمی نشاید کہ نامت نہند آدمی

ہندوستان مختلف مذاہب کے ماننے والوں، مختلف زبانوں کے بولنے والوں اور مختلف آداب و رسوم کے حامل لوگوں کا ملک ہے، فارسی تہذیب کی آفاقیت کے پیش نظر اسے ہندوستانی ماحول میں سب سے زیادہ مناسب نقطہ سمجھا گیا اور اسی کو اپنایا گیا۔ اسی کے خاطر خواہ نتیجے نکلے۔ ہند فارسی تہذیب اسی ثقافتی لین دین کا مظہر ہے۔ اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا ہمارا آج ایک قابل فخر ورثہ ہے۔

چندر بھان برہمن اسی مشترکہ تہذیب کے افق پر ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ اس کی نمائندگی کا مطالعہ کیجئے، پتا چلے گا کہ مشترکہ تہذیب کیا تھی؟ ہم قرون وسطی میں کس طرح زندگی گذارتے تھے؟ مختلف مذاہب کے ماننے والے کس طرح ایک دوسرے کے مذاہب اور عقاید کا پاس رکھتے تھے، محبت و پیار سے باہم زندگی بسر کرتے تھے۔ زندگی میں ایک دوسرے کی شخصیت کو سنوارنے اور ذہنی تربیت اور ایک دوسرے کے ترقی کے لئے کس قسم کی جدوجہد کرتے تھے۔ اور اسی طرح اس تہذیب کا ورثہ کتنا عزیز تھا جو فارسی — ہندی تہذیبوں اور تمدنوں کے امتزاج کا ثمرہ تھا۔

چندر بھان لاہور، پنجاب میں پیدا ہوا اس کے والد دھرم داس خالصہ (CROWN ESTATE) میں ایک افسر تھے اس "ہندی ہیچ مدان "(۱) و برہمن ہندی زبان "(۲) نے فارسی میں وہ دستگاہ حاصل کی کہ شاہجہاں اسے "ہندوی فارسی داں" کے خطاب سے پکارا کرتا تھا۔ چندر بھان پر کافی کام ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد عبد الحمید فاروقی صاحب نے برہمن کی زندگی اور آثار پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ پروفیسر امیر حسن عابدی کا ایک مضمون بھی اسی عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس لئے برہمن نے اردو میں بھی شعر کہے۔ اس کی ایک اردو غزل کا مطلع درج ذیل ہے۔

خدا جانے یہ (کذا) کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے، نہ پیالا ہے —(۳)

۱— چہار چمن (نی ایچ ڈی مقالہ از: ڈاکٹر شرما، دہلی یونیورسٹی) ورق ۹۹ (خطی نسخہ نیشنل میوزیم) ۲— چہار چمن کے آغاز میں برہمن نے خود کو اسی طرح متعارف کرایا ہے ۳— شمع سخن / حاشیہ، ص ۵۷۵ ۔

قرونِ وسطیٰ میں تعلیم کے میدان میں کسی تعصب اور طرفداری کو روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ مسلمان اور غیر مسلم دانشوروں سے اور اسی طرح غیر مسلم مسلمان علماء سے کسب فیض کرتے تھے۔ یہ اساتذہ اور شاگرد ایک دوسرے پر جان چھڑکتے اور اساتذہ اپنے تمام شاگردوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور شاگرد بھی اپنے اساتذہ کے احترام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ برہمن نے ملا عبدالکریم کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ برہمن نے اپنے دور میں ایک شاگرد کی تربیت و نشو و نما کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ "از جملہ شرائط تربیت عمدہ آنست کہ معلم دانا و عاقل و حق شناس باید بہم رسانید"۔

اس شرط کے بعد وہ اپنے استاد ملا عبدالکریم کا تعارف درج ذیل عبارت میں کراتا ہے جس کا ایک ایک لفظ اپنے استاد کے لئے برہمن کے دل میں احساسِ احترام اور عظمت کا آئینہ دار ہے۔ وہ کہتے ہیں "اگرچہ اہل فضل و کمال دارالشہر جنت نظیر فرقہ فرقہ و طبقہ طبقہ اند، لیکن از جائی کہ نیاز مند فیض یافتہ خدمت مخدومی ملا عبدالکریم است و ایشان را جذبہ و حالت درویشی غالب است"

برہمن خود ایک ماہر خطاط تھا۔ اس نے اس فن کو بہت اہمیت دی۔ اپنی منشآت اور چہار چمن میں ایسے متعدد خوشنویسوں کا اس نے ذکر کیا ہے جن کے بارے میں کسی دوسرے ماخذ میں مشکل ہی سے کوئی اطلاع دستیاب ہوتی ہے۔ یہ ماہر خطاط بھی اپنے دور کی فضا کے مطابق، بلا امتیاز مذہب و ملت شاگردوں کی تربیت کرتے تھے۔ برہمن نے ایک ملا عطاء الرحمان کا ذکر کیا ہے۔ یہ ماہر خطاط تھے۔ ان کے ایک شاگرد ملا جان محمد تھے جو تعلیق، شکستہ اور نستعلیق کے ماہر تھے۔ ان کے شاگردوں میں دیپ داس ولد ہر تاپ مل کایستھ نے ملا عطاء الرحمان سے بھی تربیت حاصل کی تھی۔ ملا عطاء الرحمان کی شہرت اور ان کے اعلیٰ فن کے پیش نظر خود برہمن بھی رام چند ولد بھی چند فاضل خانی کے ہمراہ ان کی خدمت میں کسب فن کے لئے حاضر ہوا اور ان سے خط تعلیق میں اصلاح لی۔

قرونِ وسطیٰ میں استعداد و قابلیت ہی کی بنیاد پر ترقی مدارج ممکن تھی۔ شاہجہاں کا دربار ایسے امراء وزراء اور ہنر مندوں سے آراستہ تھا جو اپنے دور میں خود آپ اپنی مثال تھے۔ برہمن کے بقول "چون خاطر ملکوت ناظر قدسی مآثر حضرت شاہنشاہی خدیو زمان، خلیفۂ دوران آئینہ جہان سیاست و توجہ بلند مشکل پسند اشرف اقدس اعلیٰ معروف بہ تربیت احوال ارباب ہنر مند است" اسی لئے شاہنشاہ نے مہتہ دیپ چند رستم خانی کے خط شکستہ کی تعریف و توصیف کی اسے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور اپنے دربار سے وابستہ کر لیا۔

برہمن کے متعدد بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دور میں ہنر مند خوش نویسوں کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ انہیں شاہی اور دیگر امراء و وزراء کے درباروں میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر کوئی منشی دفتر، خوشنویس بھی ہوتا تو اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ ترقی کے مدارج دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طے کرلے اور اپنے سماج میں ایک آبرو مند مقام پر فائض ہو جائے۔ شعر و شاعری اور علم و فضل کا ایسا چرچا تھا کہ اس دور میں اکثر منشیان ہنر مند اس فن سے بہرہ مند تھے۔ برہمن نے اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

در این ہنگام خاطر خواہان صحبت ارباب سخن و دیدہ مشتاق خط خوب است۔ ہر جاکہ اثری و نشانی از ارباب این ہنر می یابد، لوازم جستجو بہ ظہور می رساند

برہمن نے اپنے دور میں ذاتی استعداد و صلاحیت کی قدر دانی سے متعلق واقعات نقل کئے ہیں۔ اسی ضمن میں اس نے اکبر کی ایک نورتن راجہ ٹوڈر مل کا ایک تاریخی واقعہ بھی دہرایا ہے۔ جو قابل توجہ ہے۔ ٹوڈر مل وزارت کل کے اعلیٰ رتبے پر فائز رہے۔ کسی نے اکبر سے راجہ کی دیوانی امور میں فروگذاشتوں کا ذکر کیا اور شکایت کی کہ وہ اپنے فرائض ایمانداری سے انجام نہیں دے رہے۔ راجہ ٹوڈر مل کو اس کی اطلاع دی گئی۔ راجہ نے اکبر سے اس معاملہ کی تحقیقات کے لئے خانخانان کو متعین کرنے کی سفارش کی حالانکہ ان دنوں خان خاناں ان سے ناراض تھے۔ خان خانان نے اس رنجش خاطر کو بھلا کر سچائی اکبر کو بتائی اور مخالفین کے جھوٹ کا پردہ فاش کر دیا۔ اسی طرح شہباز خاں نے گجرات اور بنگال سے واپسی پر بھرے دربار میں راجہ ٹوڈر مل کو گلے لگایا اور اپنے گذشتہ رویئے پر معذرت چاہی۔ اکبر نے اس کی وجہ پوچھی ۔ شہباز خاں نے نہایت ایمان داری سے جواب دیا، میں جہاں گیا، میں نے اسی ہندو کے قول و تحریر کو حکومت کا دستور العمل پایا۔ اس لئے میں نے راجہ سے معذرت چاہی ہے۔ ابوالفضل کے بقول راجہ ٹوڈر مل نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ کسی اور سے ممکن نہیں ہو سکے۔ حتیٰ کہ برہمن کے دور میں میاں شاہ میر نے جو شاہجہاں کے لڑکے دارا شکوہ کے پیر و مرشد بھی ہیں، شاہجہاں سے راجہ ٹوڈر مل کی آبادکاری کی کوششوں اور بندوبست کی صلاحیتوں کی بڑی تعریف کی۔

یہ تھا انداز زندگی اور طرز معاشرت اس دور کا جب صلح کل کا دور دورہ تھا اور ہندوستان سے اخوت یگانگت اور آپسی میل ملاپ کی وہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جس نے ساری متمدن دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ یہ نتیجہ تھا اس تہذیب کا جو ہند فارسی تہذیب کے امتزاج سے ہمارے عظیم ملک میں پروان چڑھ رہی تھی۔

برہمن شاہجہاں کے مختلف وزراء اور امراء کے درباروں سے وابستہ رہا۔ شاہزادہ دارا شکوہ کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوا۔ آصف خان، افضل خان، اسلام خان، سعد اللہ خان، معظم خان، جعفر خان، عنایت خان وغیرہ وہ شاہجہانی امراء ہیں جنہوں نے برہمن کی سرپرستی کی۔ ان میں افضل خان سے برہمن کے تعلقات بہت نزدیکی تھے۔ افضل خان برہمن پر بہت مہربان تھے۔ یہ شاہجہاں کے دور میں وزیر کل کے مقام پر فائز اور نہایت بلند ادبی ذوق کے حامل تھے۔ برہمن نے افضل خان کی عنایتوں کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"از عنایت قدردانی و لطف عنایتی کہ زیادہ از حالت و حوصلہ این نیاز مند بود،، مرعی و مبذول گردانیدند و درہماں وقت قلمی از قلمدان برآوردہ فرمودند کہ این قلم بنویس و بعد ازیں بہ این اسلوب بتراش، رفتہ رفتہ نسبت عبودیت از عنایت رسوخ عقیدت و صفائی طویت و دوستی اخلاص راستی محض و دوام خدمت بہ مرتبۂ معروفیت رسید"۔

افضل خان کے دربار سے ایران توران اور ہندوستان کے قاعدہ دان خوش نویس منشی وابستہ تھے، لیکن افضل خان، برہمن پر خاص عنایت کرتا تھا۔ اس خصوصی مہربانی و عنایت کا اظہار اس نے اس طرح بھی کیا کہ ایک بار شاہجہاں لاہور میں افضل خان کے گھر آیا۔ افضل خان نے اس وقت برہمن کو شاہی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے علاوہ افضل خان نے برہمن کو ایک ہاتھی بھی مرحمت کیا تاکہ وہ اس کے ساتھ اسی پر سوار ہو کر راستہ طے کیا کرے۔

افضل خان مجالس میں اکثر قدردانی کے طور پر برہمن کے اشعار پڑھا کرتا تھا۔ ان میں شعر یہ تھا

نظر بہ شاہد معنی زپردہ دوختہ ام
حجاب عینک چشم است مرد بینا را

افضل خان کے گھر اکثر روحانی و علمی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ جن میں علما، فضلا، شرکت کرتے تھے۔ افضل خان نے برہمن کو ان مجالس میں شرکت کی اجازت دی تھی اور اسی طرح وہ برہمن کی تربیت کر رہا تھا۔ برہمن ان مجالس کی روئیداد بھی قلم بند کرتا تھا۔ برہمن کے بقول: "افضل خان در لباس ظاہر تماشائی عالم معنی می نمود و در عالم کثرت شاہد وحدت را مد نظر داشت"

افضل خان کے انتقال کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ افضل خان کے متعلقین کو اس کی خدمت میں پیش کیا جائے جب برہمن کو متعارف کرایا گیا۔ تو اس نے اپنی ایک تحریر بادشاہ کو پیش کی جسے خط شکستہ میں خود برہمن نے کتابت کیا تھا۔ بادشاہ کو یہ تحریر بہت پسند آئی۔ اسی موقع پر برہمن نے بادشاہ کی تعریف میں یہ رباعی پڑھی

شاہی کہ مطیع او دو عالم باشد ہر جا کہ سری است بر در ش خم باشد

ابر سکہ بدو رش آدمی یافت شرف خواہد کہ فرشتہ نیز آدم باشد

شاہجہاں کی علم دوستی اور ادب پرستی کسی تعارف کی محتاج نہیں اس کے عہد دربار میں علمی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ شعرا کے کلام پر تبصرہ ہوتا تھا۔ ان کی خوبیوں کو سراہا جاتا اور برائیوں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ایک بار مجلس وزن منعقد ہوئی حکیم عبدالخالق نے جو سخن فہمی اور سخن گوئی میں معروف تھا۔ مانرساد کے لئے ایک غزل پیش کی۔ شاہجہاں نے پسند کیا۔ غزل کے الفاظ و معنی کی نزاکت و لطافت نے شاہجہاں کو متاثر کیا۔ غزل کے درج ذیل دو مصرعوں پر ایک ہفتے تک مطارحہ ہوتا رہا

سال نو را کہ کس ہر سال و سال کہنہ را

بلا نوکس از سر نو تا جہاں دار مد گشت

یہ تھی ادبی فضا جس میں برہمن نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی۔

مجالس شعر و سخن صرف بادشاہ ہی منعقد نہیں کرتے تھے، اس کے درباری امرا، وزرا اور دیگر اہل ذوق بھی اپنی اپنی رہائش گاہوں پر یہ مجالس ترتیب دیتے تھے۔ ان مجالس کا مقصد محض شعر پڑھنا اور سننا نہیں تھا بلکہ جو گفتگو اور بحث مباحثہ ان مجالس میں ہوتا اس کا مقصد مبتدیوں اور نوآموزوں کی تربیت تھا۔ برہمن نے ایسی متعدد مجالس شعر و سخن کا ذکر کیا ہے جہاں اہل ذوق بلا امتیاز مذہب و ملت جمع ہوتے اور اپنے اپنے کمال سخن اور فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

برہمن نے ایسی ہی ایک مجلس کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ جب وہ اپنے وطن لاہور میں تھا، تو سیادت مرتبت میر عبدالکریم کے گھر میں ایک مجلس شعر و سخن منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں بقول برہمن طوطی شکرستان فصاحت و بلاغت ملا میر (لاہوری) اور دوسرے احباب مثلاً جلال دہلوی، ملا انور قاسم جانی، ابو سعید حافظ آبادی، ملا عبدالرحیم منشی اور ملا جانی محمد سیالکوٹی جیسے صاحبان کمال اور منشیان بلاغت آثار نے شرکت کی۔ اس روحانی مجلس میں سب نے اپنا کلام سنایا اور یہ مجلس آغاز شام سے مطلع صبح تک جاری رہی۔ اس محفل میں ملا ابو سعید نے ایک قصیدہ پیش کیا جس کے تمام الفاظ بے نقط تھے۔ چونکہ یہ عمل آسان نہیں اس لئے میر عبدالکریم نے ملا ابو سعید کی مناسب قدردانی کی۔

برہمن نے ایسی ہی ایک دوسری مجلس کا ذکر بھی کیا ہے جو اکبر آباد میں خواجہ محمد صادق کے گھر ہفتے میں دو بار ترتیب دی جاتی تھی۔ اور برہمن کو جب بھی اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی وہ اس محفل میں شرکت کرتا اور اپنا کلام بھی بہ غرض اصلاح پیش کرتا۔ اس مجلس کے بارے میں خود برہمن کے الفاظ ملاحظہ کیجئے۔ جو اس اخوت و آپس کے نہایت قریبی اور پر خلوص تعلقات اور ایک دوسرے

لے پاس احترام کے ترجمان ہیں۔ برہمن نے اپنے بھائی کو ایک خط میں اس مجلس کی اطلاع دی ہے کہ:

"بر ضمیر منیر آئینہ نظیر برادر کامگار برخوردار پوشیدہ مباد کہ ایامی کہ کمترین بندگان برہمنان عقیدت کیش در خدمت و صحبت تجرید العصر والدوران علامہ روزگار والامقدار افضل خان کسب سعادت می نمود، در دار الخلافت اکبرآباد مجلس رنگین و صحبت دلنشین در خانۂ معارف آگاہ خواجہ محمد صادق منعقد می شد و یاران صاحب سخن از ہر طرف جمع آمدہ ہنگامۂ سخن را گرم می داشتند۔

فصاحت و بلاغت مرتبت ملا شیدا کہ از شعرای مشہور روزگار بود ملا منیر و ملا جلالی، و ملا دہلوی و ملا عبدالرحیم و میر برہان ملا حشمتی و ملا عبد اللطیف منشی و دیال داس برہمن از اجزای این مجلس بودند

برہمن نے ایک دوسرے خط میں اپنے بھائی کی توجہ اپنے دور کے اس ہندوستان کی طرف مبذول کرائی ہے جس کے ہر گوشہ و کنار میں صاحبان علم اربابان فضل اور اصحاب خط و انشا رونق افروز تھے (وہ کہتا ہے کہ. معلوم برادر ہنر دوست باد کہ اگرچہ در عرصۂ مملکت کنار و ہر سو زیادہ از آنند کہ قلم شکستہ رقم این قلیل البضاعت متکفل ادای آن تواند شد۔)

قرون وسطی اور خاص طور پر برہمن کے دور میں ذاتی تعلقات کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہر شخص اپنے شناسا اور جان پہچان والے کی احوال پرسی کرتا۔ اس کے دکھ سکھ میں برابر شریک ہوتا۔ برہمن کچھ دن کے لئے سیالکوٹ میں مقیم رہے۔ وہاں بعض اشخاص سے ان کی دوستی ہو گئی۔ ایک بار سعید خان کے بھائی افتخار خان سے وابستہ ملا ولی منشی سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ برہمن دوڑ کر ان کے پاس پہنچے تاکہ اپنے شناساؤں اور احباب کی خیریت دریافت کریں۔ اتفاق سے ملا ولی انہیں تشفی بخش جواب نہیں دے سکے۔ برہمن مضطرب ہو گئے۔ انہوں نے اپنے بھائی کو خط لکھا اور حکم دیا کہ وہ سیالکوٹ میں ان کے تمام دوستوں کی خیریت معلوم کریں اور انہیں مطلع کریں۔

برہمن ایک صوفی منش انسان تھے۔ حالانکہ وہ مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ ہر طرح کا عیش و آرام انہیں میسر تھا، لیکن دنیا ان کے لئے ہیچ تھی۔ انہوں نے روحانی ترقی ہی کو اصل مقصد سمجھا۔ جب کبھی موقع ملا وہ حقیقت آگاہوں کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ اس نے اپنے بھائی کو متعدد خطوط میں اس امر کی تشویق دلائی ہے کہ وہ کبھی کسی نہ کسی صاحب حال سے وابستہ ہو جائے تاکہ اسے دونوں جہانوں کی نعمتیں میسر آجائیں۔ وہ میاں میر کا ارادات مند تھا۔ اس نے بابا لعل اور دارا شکوہ کے درمیان عرفانی مسائل پر ہونے والی گفتگو کو فارسی میں محفوظ کیا ہے۔ (۱)

برہمن نے متعدد ہندو اور مسلمان عارفوں کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک بار وہ سیالکوٹ گیا اس قصبے میں رسم تھی کہ ہفتے میں ایک بار یہاں کے رہنے والے پیر علی الحق کے مزار پر جمع ہوتے اور آپس میں ملتے جلتے تھے۔ جب سیالکوٹ میں اس کے قیام کی اطلاع لوگوں کو ہوئی تو بڑی تعداد میں اس کے احباب اس سے ملنے آئے۔ ان میں ملا دو پیازہ کے لڑکے ملا شغلی بھی شامل تھے۔ یہ اچھے شعر کہتے تھے۔ سیالکوٹ میں برہمن کے دور میں ایک صاحب لنگن نامی رہائش پذیر تھے انہوں نے ملا دو پیازہ کی صحبت پائی تھی۔۔۔۔ اور وہ اپنے اس تعلق کا فخر سے ذکر کیا کرتے تھے۔

برہمن نے سندھ میں مقیم دیال پور نام کے ایک درویش کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ صاحب حال بزرگ تھے۔ بڑی تعداد میں لوگ ان کی خدمت میں کسب فیض کے لئے حاضر ہوتے تھے۔۔ بقول برہمن "او در عین کثرت با خود در خلوت است"۔

۱۔ مکالمۂ مجمع البحرین کے ہمراہ ایران سے شائع ہو گیا ہے

برہمن کے ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں ہندو اور مسلمان صاحبان معرفت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ سب کی توجہ معرفت خداوندی کی طرف تھی۔ وہ خدا تک پہنچنے کے لئے مختلف راستوں میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دارا شکوہ نے اسی دور میں مجمع البحرین تالیف کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہندو مت اور مذہب اسلام روحانیت کا درس دیتے ہیں اور دونوں مذاہب میں روحانیت کو بڑا درجہ حاصل ہے۔ برہمن ایسے ہی روحانی ماحول کا ساختہ و پرداختہ تھا اس کے مربی افضل خان بھی رقت طبع اور صفائے باطن کے حامل تھے۔ ایک روز برہمن اپنے اسی سرپرست سے محو گفتگو تھا۔ برہمن نے ضمناً کہا تھا تضیع اوقات شدید تر است از مفارقت روح، یعنی اوقات کا برباد کرنا روح کی مفارقت سے زیادہ شدید ہے۔ برہمن نے اس کی وجہ بھی بیان کی اور وہ یہ ہے کہ تضیع اوقات خالق سے رشتہ توڑ دیتی ہے اور مفارقت روح کے نتیجے میں مخلوق سے رہائی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک عارفانہ توجیہہ تھی جسے سن کر افضل خان پر رقت طاری ہو گئی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرائض منصبی میں مشغول رہنے کی وجہ سے افضل خان بادۂ عرفان سے محروم رہے جس کا انہیں ہمیشہ افسوس رہا۔ برہمن اور افضل خان کے تعلقات کی نوعیت اور خود برہمن کے ذہنی میلانات کا اندازہ اس تحریر سے لگائیے جو اس نے اپنے بھائی کو لکھی تھی۔

مقصود اصلی تہذیب اخلاق است کہ چون آدمی مہذب الاخلاق گردد، بر آئینہ ضمیر منیر، ہر صورت مطلوب جلوہ گر گردد

ایں نیاز مند اگر چہ گرفتار قید تعلق است، اما در حصول اخلاق حمیدہ فرصت را از دست نمی دہد و پیوستہ مشق ایں معنی در خدمت و صحبت علامۃ العصر و الدوران افضل خاں می نماید

خلاصہ یہ ہے کہ قرون وسطی کا ہندوستانی سماج بہترین انسانی رشتوں کے نشوو نما کا مظہر تھا۔ اعلی ترین انسانی اقدار اس دور میں کارفرما ہیں اور ایسی اقدار کی ترویج و اشاعت میں فارسی زبان اور فارسی تہذیب نے نہایت فعال اور موثر رول ادا کیا ہے جس پر فارسی دوستوں کو بجا طور پر فخر کرنا چاہئے۔

---

(۱) یہ مقالہ مجمع البحرین کے ہمراہ ایران سے شائع ہو گیا ہے۔

فنِ مکتوب نگاری

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی
(سابق صدر و پروفیسر، شعبۂ اردو ـ صوفایہ کالج فور ویمن ـ ممبئی)

''کسی زبان کے ادب اور اس زبان کو ذریعہ اظہار بنانے والوں کی اقدار حیات میں ایک رشتہ باہمی ہوتا ہے۔ فی الحقیقت یہ دونوں ناگزیر ہیں اور لازم و ملزوم۔ ایک زبان کی پائندگی کا انحصار اس امر میں پنہاں ہے کہ وہ عام زندگی اور ماحول کے معاشرتی مد و جزر سے ہم آہنگ رہے۔ حیات اردو کا تموج مذکورہ تفسیر کی ایک حسین روئیداد ہے۔

حصول آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد سے اردو زبان نے اپنے ادب اور بالخصوص میدان نظم میں لاجواب کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اس تگ و دو میں اردو نثر بھی پیچھے نہ رہی۔ اس میں جہاں ناول اور افسانے میں بے پناہ وسعتیں اور پہنائیاں پیدا کیں وہاں ایک اور صنف ادب کو بے پایاں فروغ دیا اور اسے حسن قبولیت سے آراستہ و پیراستہ کیا اور یہ صنف ادب ہے۔ ''مکاتیبی ادب''

اس نئے سورج (مکاتیبی ادب) کے تعلق سے شمس الرحمان فاروقی کا یہ قول کافی غور طلب ہے۔

''یہ نیا سورج (مکاتیبی ادب) اگرچہ ابھی اپنی کرنوں میں بن سنور رہا ہے لیکن یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ وہ طلوع ہو کر اردو ادب کے قدر دانوں کو کتنے ایسے گنج ہائے گراں مایہ سے روشناس کر دے گا جن کے بغیر نہ ادب کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس کے حسن و قبح کا ٹھیک اندازہ لگانا ممکن ہے''

مکتوب نگاری ایسی صنف ادب ہے جس سے ہر خیال و معیار کا انسان بلا امتیاز پست و بالا و اعلیٰ مسرور ہوتا ہے۔ مکاتیب میں زندگی کے ہر پہلو پر خیال آرائی کی جاسکتی ہے۔ بہر حال ایک اچھے مکتوب نگار کے خطوں میں ہر شخص کیلئے کچھ نہ کچھ سامان دل بستگی ہوتا ہے۔

ان خطوط کے ذریعے ہم مکتوب نگار کو اپنی اسی روز شب کی دنیا میں حرکت کرتے اور معمولی دلچسپیوں میں منہمک پاتے ہیں۔ جہاں زندگی اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ اپنے حقیقی خد و خال میں چلتی نظر آتی ہے۔

بقول خورشید الاسلام۔۔۔۔۔

''دنیا کے سارے خط ایک فقرے سے شروع ہوتے ہیں اور ایک فقرہ پر ختم۔ یہ فقرہ بہت مختصر بھی ہے اور بے کنار بھی، ہم اور تم انسان ہیں''۔

مولوی عبدالحق ''خطوطِ شبلی'' کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

''خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی پردہ داری کا کھٹکا نہیں رہتا۔

گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشہ لائم نہیں۔ یہ دلی جذبات اور خیالات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ مگر کون ہے جو اس خاموش آواز کو سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں آپ بیتیوں اور خطوط کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں''

اسرار و رموز:

یہ عین ممکن ہے کہ مکتوب نگاری کے اسرار و رموز سے انسان ہزاروں برسوں سے واقف رہا ہو، لیکن انہیں عملی جامہ اس نے بہت بعد میں پہنایا۔ یہی سبب ہے کہ زمانہ قدیم میں جو مکتوب نگاری کی جاتی تھی وہ اظہار ضرورت کا جواز ہوتی تھی یا پھر اپنے واقعات کی ایک جگ بیتی یا ایک تحریری دستاویز۔ تب رفتہ رفتہ انسان مکتوب نویسی کو اپنی ذہنی قابلیت اور لیاقت علمی کے مظاہرے کیلئے بروئے کار لانے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایسے خطوط مکتوب الیہ کیلئے چاہے کوئی اہمیت رکھتے ہوں، دوسروں کیلئے نہیں۔ کاروباری اور تجارتی مطالبات کے تحت لکھے ہوئے خطوط اکثر عنصر دلچسپی و دل بستگی سے قطعاً محروم ہوتے ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ عمرانی زاویے سے تہذیب و تمدن کے سلسلہ وار ارتقا کا انعکاس مکتوب نگاری کے ذوق و شوق اور اسالیب مکتوب نگاری میں بے شبہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ تاریخی تقدیر (۱) بھی پیش نظر رہے کہ تہذیب و تمدن کو اپنی ارتقائی منازل مذہب اور حکومت کے زیر سایہ ہی سر کرنا پڑتی ہیں۔ اسی لئے ''خطوط نویسی کے گلستاں میں ہمیں جو پھل پھول نظر آتے ہیں ان کا وجود ان دونوں (مذہب اور حکومت) کا رہین منت ہے''۔ یہ محض ایک قیاس ہے، تحقیق اس موضوع پر قدرے خاموش ہے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ اپنی فطری اور جبلی خصوصیت کے طفیل بات چیت کرنے کی پیدائشی خواہش کی بنا پر انفرادی طور پر لوگوں نے مذہب اور حکومت کے علم برداروں کے تسلط سے کہیں قبل خطوط نگاری کی ابتدا کر دی ہو۔ ورنہ جو خطوط کے مجموعے یا خطوں کے نمونے ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔ انہیں تاریخی اعتبار سے وہی خطوط مقدم ہیں جو بادشاہوں، حاکموں، اور وزیروں نے اپنے دور اقتدار میں عاملین یا نائبین کو لکھے اور جو سرتاپا شاہی احکامات پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ وہ پاکیزہ و مقدس خطوط ہیں جو مذہبی پیشواؤں اور اخلاقی رہنماؤں نے اپنے ارادت مندوں، مریدوں اور پیروکاروں کو روانہ کئے۔ یہ خطوط روحانی گنج ہائے گراں مایہ سے کم نہیں اور مذہبی اسرار و رموز کی وضاحت کے بہت عمدہ وسائل و مآخذ ہیں۔ بہر کیف مکتوب نگاری نسبتاً ایک آسان صنف ادب ہے اور اسی لئے خوب پروان چڑھی۔

معاشرتی اور مجلسی تعلقات کی استواری میں خطوط نگاری کو جو اہمیت حاصل ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

HISTORICAL DETERMINISM (1)

افادیت:

خطوط کی عام مقبولیت کا راز ان کی فطری سادگی میں مضمر ہے۔ یہاں خیالات و تصورات، ریاکاری، تصنع اور تکلف کے لبادوں میں ملفوف نہیں ہوتے

جیسا کہ دوسری اصناف ادب میں عموماً ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف مکاتیب کو حاصل ہے۔ جس میں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا کسی قسم کی ملاوٹ کے اپنے ان خیالات کا اظہار کرتا ہے جنہیں انشائیہ نگاری کی کوئی صنعت مسخ نہیں کر سکتی اور نہ ہی تشبیہات و استعارات و کنایات کا بار گراں انہیں مضحکہ خیز بنا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر مکتوب نگار اپنے دل و دماغ کے دریچے وا کر دیتا ہے اور جو کچھ ان پر گزرتا ہے بلا کم و کاست قرطاس ابیض کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایک نقاد کا قول ہے۔

'' یہاں (مکتوب نگاری) مشق و ریاضت سے بنے ہوئے اور فطرت کے کارخانے میں تیار کئے ہوئے ادیب ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ سرسری خیال اگر اس پائے کا ہو کہ انشا پردازی اس کی بلائیں لے تو یہ بھی کمال کا ایک ایسا رخ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ''

مہدی الافادی فرماتے ہیں۔

'' نجی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اظہار خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے اسی لئے لٹریچر کا یہ ایک اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والوں کے مرتبہ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔ اچھے اچھے بولنے والوں اور چوٹی کے شاعروں کو دیکھا ہے کہ وہ دو سطریں بھی سیدھی سادی نہیں لکھ سکتے ''۔

مکتوب نگاری کے ذریعے ہم اکثر مکتوب نگار کی زندگی کے بہت سے اہم یا غیر اہم واقعات کی آگاہی پاتے ہیں جو کسی اور طریقے سے ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ معاشرہ کے قواعد اور عام اجتماعی زندگی کی بہت سی پابندیاں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے بہت سے حالات (جو زیادہ تر تلخ اور منفی نوعیت کے ہوتے ہیں) کو دنیا کی نگاہوں سے دور رکھے مگر اکثر اضطراری طور پر غیر محفوظ لمحات میں وہ اپنے مخصوص حلقہ احباب میں ان کمزوریوں اور مجبوریوں کا اظہار کر کے طمانیت قلب حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ تسکین اسے مکتوب نگاری سے حاصل ہوتی ہے اور جو قاری کے لئے حظ و انبساط یا صبر و شکر کا سامان لیکر جلوہ گر ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں ـــــــ '' وہ (مکتوب الیہ) بعض اوقات ایسے افراد ہوتے ہیں جن کی نسبت یہ گمان ہوتا ہے کہ معاملہ ان تک ہی رہے گا اور افشا نہ ہوگا اور اسی لئے کبھی کبھی وہ (مکتوب نگار) ایسے اسرار بیان کر جاتا ہے اور دل کی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو کبھی وہ زبان پر نہ لاتا اور نہ حوالہ قلم کرتا، اور شاید اسی کے ساتھ مدفون ہو جاتیں، لیکن اسے کیا خبر کہ رقیب گھات میں لگے ہوئے ہیں جو اس کے ایک ایک پرچے کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اسکے راز کو ڈنکے کی چوٹ بیان کریں گے ''

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ سوانح نگاری کے ضمن میں مکاتیب ایک نمایاں ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ قول سو فیصدی درست ہے ـــ '' خطوط سوانح نگاری کی جان ہیں ''

خطوط فن نقد کی بھی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں۔ مکاتیب فی الحقیقت مصنف (ادیب شاعر) کو قاری کے بہت قریب لے آتے ہیں اور وہ ان کی مدد سے فنکار کی فنی تخلیقات کو ایک صالح اور معقول پس منظر پر جانچنے کا موقع پاتا ہے۔ '' آج کل ترقی یافتہ ممالک میں بڑے آدمیوں اور قابل قدر ادیبوں کے خطوط جمع کرنے کا کام بڑی تیزی سے انجام پارہا ہے اور ان کی مدد سے ان کی تخلیقات کو نقد و نظر کے جدید اصولوں پر پرکھا اور جانچا جا رہا ہے ''ـــ

نثری ادب میں مکتوب نگاری کو اگر ''مجموعہ الفنون'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان میں وہ تمام موضوعات زیر بحث آتے ہیں جو کسی بھی ادب العالیہ کا سرمایہ ہو سکتے ہیں۔ فن تنقید کو سرتاج ادب کہا جاتا ہے تاہم اس کی ابتدا بھی خطوط کے ذریعے ہوئی۔ اردو تنقید کا اوائلی مرحلہ بھی خطوط تھے جو بعض فنکاروں نے اپنے اعزا و اقارب کو لکھے...... سچ تو یہ ہے کہ جس آزادی کے ساتھ تنقید کا حق خطوط میں ادا کیا جاتا ہے وہ کسی اور تحریر کے احاطۂ اثر سے بعید ہے۔ اردو زبان میں غالب کے خطوط کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں سینکڑوں ادبی و لسانی رموز و نکات زیر بحث آگئے ہیں۔

قواعد و ضوابط:—

کسی مکتوب کے معیار حسن و قبح کا جائزہ لینے کیلئے یہ مقولہ ذہن نشیں رکھنا لازمی ہے —— ''ایک خط کیا ہے؟ نصف ملاقات!'' یہ بھی خیال رہے کہ یہ ''نصف ملاقات'' پر لطف اس لئے بن جاتی ہے کہ ایک طرف سے خوب بات چیت ہوتی ہے اور دوسری جانب مکمل خاموشی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ یہ 'نصف ملاقات' مکمل گفتگو پر فضیلت رکھتی ہے کیونکہ ایک مکتوب نگار بعض اوقات اپنے خط میں وہ کچھ کہہ جاتا ہے جنہیں بالمشافہ بیان کرنے میں بہت سی فطری، غیر فطری، اندرونی بیرونی، باطنی یا خارجی پابندیاں حائل ہوتی ہیں۔ دل کی باتیں ادا کرنے، بہت سی الجھنوں کو سلجھانے، بگڑے ہوئے کو منانے، ندامت کا اظہار کرنے، یا معافی طلب کرنے میں ہمارے خطوط ہماری بہت اچھے پیمانے پر مدد کرتے ہیں۔

انسان کی مجلسی حس یا معاشرتی فطرت اسے ہمیشہ محو تکلم ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ بیتی سنانے، جگ بیتی سننے، حصول مسرت وغیرہ کی تحریک یا کسی مادی ضرورت، تمدنی حاجت تہذیبی مطالبہ اور عموماً مخاطب کی دوری افتادگی مکتوب نگاری کا سبب خاص بنتے ہیں۔ چنانچہ ایک عمدہ مکتوب کی شناخت یہ ہے کہ وہ ملاقات کے تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کرے۔ اس خوبی سے آراستہ خط ہر شخص کی توجہ حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس جس خط میں کاروباری رنگ تاجروں کی ذہنیت اخباری نمائندوں یا صحافتی خبر فروشوں کی شخصیت منعکس ہوتی ہے ان کی افادیت بھی ایک روزنامے کی رپورٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ باہمی ملاقات میں جس انداز سے گفتگو کی جاتی ہے اگر وہی انداز کسی خط میں جلوہ گر ہو جائے تو اسے اسلوب نگارش کا کمال کھنا چاہئے۔

انسان کی مجلسی حس یا معاشرتی فطرت اسے ہمیشہ محو تکلم ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ بیتی سنانے، جگ بیتی سننے، حصول مسرت وغیرہ کی تحریک یا کسی مادی ضرورت، تمدنی حاجت تہذیبی مطالبہ اور عموماً مخاطب کی دوری افتادگی مکتوب نگاری کا سبب خاص بنتے ہیں۔

چنانچہ ایک عمدہ مکتوب کی شناخت یہ ہے کہ وہ ملاقات کے تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کرے۔ اس خوبی سے آراستہ خط ہر شخص کی توجہ حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس جس خط میں کاروباری رنگ تاجروں کی ذہنیت اخباری نمائندوں یا صحافتی خبر فروشوں کی شخصیت منعکس ہوتی ہے اس کی افادیت بھی ایک روزنامے کی رپورٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ باہمی ملاقات میں جس انداز سے گفتگو کی جاتی ہے اگر وہی انداز کسی خط میں جلوہ گر ہو جائے تو اسے اسلوب نگارش کا کمال کھنا چاہئے۔

اردو مکتوب نگاری کے اوائلی اسالیب کلیۃً فارسی زدہ تھے مکتوب نگاری کے ضمن میں غالب کی انقلاب انگیز کاوشوں کے باوجود ان کے یہاں بھی وہی فارسی انداز نگارش نظر آتا ہے۔ یوں بھی عام مجلسی زندگی میں اس زمانے میں زیادہ تر خطوط فارسی زبان ہی میں لکھے جاتے تھے۔

تاہم اردو میں مکتوب نگاری کے باقاعدہ آغاز سے تقریباً ۳۰ سال قبل یعنی ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ غالب نے فارسی خطوط نگاری کے پیش نظر کچھ اصول و ضوابط مرتب کئے تھے۔ گو ان باتوں کا تعلق فارسی مکتوب نگاری سے ہے لیکن کسی دوسری زبان کے خطوں میں دلکش اور دل پسند افزائش اسلوب کیلئے ان قواعد پر عمل کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا۔

غالب کے نقطۂ نگاہ سے مکتوب نگاری کے قواعد درج ذیل ہیں۔

(۱) خط کی ابتدا میں مکتوب الیہ کو اس کے موافق حال کسی ندائیہ لفظ سے پکارا جائے۔

(۲) اس کے فوراً بعد حرف مدعا پر آجانا چاہئے۔

(۳) القاب، آداب، خیریت گوئی اور خیریت طلبی قطعاً زوائد و بیکار ہیں۔

(۴) بات اس انداز سے کی جائے کہ تحریر میں تقریر کا رنگ آجائے۔

(۵) ادائے مطلب نہایت صاف ستھرے انداز سے کیا جائے تاکہ مکتوب الیہ کو اسے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

(۶) نفس مضمون ایسے ترتیب دیا جائے جہاں کسی الجھاؤ یا گنجلک کا شائبہ تک نہ رہے۔

(۷) الفاظ پیچیدہ نہ ہوں کہ ان سے اجزائے مطلب غلط طریقے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ تکرار بیان کی بد نمائی بھی پیدا ہو سکتی ہے اور یہ قطعاً نامناسب ہے۔

(۸) ان مشکل، دقیق اور غیر مانوس الفاظ، ترکیبات و محاورات سے اجتناب کیا جائے جو زمانے کے مذاق سے لگا نہ کھاتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں مکتوب نگار کو وہی انداز تحریر اختیار کرنا چاہئے جو اس کے روزمرہ کے انداز تقریر کا ہے۔

(۹) تکرار الفاظ بلکہ ہم حرفی الفاظ کے استعمال سے بھی احتراز کرنا ضروری ہے۔

(۱۰) خط میں فصاحت کا احترام کرنا چاہئے، فصاحت بمعنی ایسے نفیس الفاظ جو ثقیل نہ ہوں، غیر مانوس نہ ہوں، نہ کانوں کو تکلیف دیں، نہ دماغ پر بوجھ بنیں۔

(۱۱) خط کو بیجا طوالت دینا بھی مناسب نہیں۔

(۱۲) مکتوب الیہ کے حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا جائے۔ اس کے رتبے اور درجے کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

مذکورہ بالا قواعد و ضوابط کی روشنی میں خورشید الاسلام کے تصورات کا تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انہوں نے اہل مغرب کی مکتوب نگاری کے تحت چند اصول مرتب کئے ہیں تاہم انہوں نے غالب کے قواعد مکتوب نگاری کو جائز اہمیت دی ہے۔ اپنے ان اصولوں کو بیان کرنے میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز نگارش کے تمام تیور اور نقوش برقرار رکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

(۱) "فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے کیلئے کچھ اصول ہیں کچھ ضابطے ہیں۔ لیکن محبت کرنے کیلئے نہ علم سینہ درکار ہے نہ علم سفینہ، خط لکھنے کیلئے بھی کاغذ اور قلم کی ہی ضرورت نہیں ہوتی، کسی حد تک خون جگر، بھی درکار ہوتا ہے اور جہاں یہ ہو وہاں بے اصولی بھی اصول بن جاتی ہے۔ لغزشیں حسین ہو جاتی ہیں۔

(۲) 'عدم' سے 'وجود' میں لانے کا کام 'نہیں' کو 'ہاں' میں بدل ڈالنا کچھ نہیں ہے، سے کچھ تو ہے' کا معجزہ دکھانا خطوط نگاری کا کام ہے

(۳) خط میں نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ نہ وسط نہ تکمیل، نہ تشبیب نہ دعائیہ، بس گریز ہی گریز ہے اور ہزاروں سال کے تجربے نے جو ہمیں بتایا ہے وہ یہ ہے کہ گریز ہی میں زندگی کا حسن ہے کیونکہ زندگی خود ایک گریز ہے۔

(۴) زندہ رہنے کیلئے اور خط لکھنے کیلئے زندگی کا احترام ضروری ہے۔ آخر خط ہے کیا چیز؟ حسنِ اتفاق اور زندگی کیا ہے؟ اتفاقات کا ایک مجموعہ! چنانچہ خط کی کائنات یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں کہ انہی میں زندگی کا لطف ہے، زندگی میں لمحے ہی قیمتی ہوتے ہیں اور جو ان لمحات کو گرفتار کر لیتا ہے اور پھر اپنے ہمدموں اور رازداروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ خطوط نگاری کرتا ہے۔

(۵) جن میں استدلال کا زور ہو، فلسفے پر باقاعدہ بحثیں ہوں یا بالارادہ فنکاری ہو انہیں کسی قیمت پر خط نہیں کہا جاسکتا۔ خط میں مرزا بیدل کے اشعار کی گنجائش ہے مگر ان کی ماورائیت پر مدلل بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ قہقہے لگا سکتے ہیں، رو سکتے ہیں مگر دونوں کی ماہیت پر مضمون نگاری نہیں کر سکتے

(۶) دنیا کے سارے خط ایک فقرے سے شروع ہوتے ہیں اور ایک فقرے پر ختم ہوتے ہیں،
یہ فقرہ بہت مختصر بھی ہے اور بے کنار بھی، اور وہ ہے کہ "ہم اور تم انسان ہیں"۔

(۷) ناول یا افسانے میں ایک عوامی یا عالمی کو مدنظر رکھا ہوتا ہے لیکن خط میں صرف دو انسان ہوتے ہیں ایک باتیں کرنے والا اور ایک باتیں سننے والا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی زندگی کے سبک، دلکش اور نازک پہلو جو اس کی بلند ترین ادبی کاوشوں میں نظر نہیں آتے خطوں میں بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

(۸) واقعہ یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی خواہش اپنے آپ کو نمایاں کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی سب سے بڑی خواہش اپنے آپ کو چھپانا ہوتا ہے۔ تاہم اگر کسی انسان کی لغزشوں پر ہنسنا یا اس سے ہمدردی کرنا مقصود ہو،
اس کے حقیقی خدوخال سے واقف ہونا ہو، اسے صحیح معنوں میں برہنہ دیکھنا ہو، تو اس کے ادبی کارناموں کی ورق گردانی کی بجائے اسکے خطوں کا روحانی سفر کیجئے

(۹) خطوں میں آپ حکومتوں کا زوال دیکھیں گے، ان میں بیمار بعض اوقات تندرست معلوم ہونگے، غم پسند، مسرور نظر آئیں گے مغرور و گستاخ انسان دوست دکھائی دیں گے "قہقہے لگانے والے" حزن و ملال کی تصویر، عابد شب زندہ دار، رند مشرب، بزدل، بہادر اور سورما انسانیت کے زیور سے آراستہ ملیں گے۔

(۱۰) جن خطوں میں انسان نے اپنے اوپر قابو پالیا ہو، جہاں وہ خود ہو، جہاں آپ اس کے رازدار بن سکیں، وہ آپ کو دوست معلوم ہو، جہاں آپ اسے گدگدیاں کریں اور وہ مچل جائے، وہیں فتح ہے۔ وہ خط ادبی کارنامہ ہے، جس کی بدولت لکھنے والا ان چند لمحوں کی طرح لازوال ہو جاتا ہے۔ جنہیں جنبشِ قلم نے محفوظ کر لیا ہے۔

(۱۱) خطوں کو نجی ہونا چاہئے، ایک اچھا مکتوب نگار نجی باتوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے، کہ یہ باتیں ہمیں اپنی ہی داستان معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ عام باتیں اس لئے غیر معمولی ہیں کہ یہ "عام انسانوں کو" مخصوص "کر دیتی ہیں۔ انسان اپنی خاص خاص حماقتوں، انوکھی دلچسپیوں اور غیر شعوری حرکتوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ رنگ بے شمار نہیں ہیں۔ ان رنگوں کی باہمی آمیزش میں تمام ستم ظریفی ہے۔ اسی لئے دنیا

ایک بھی ہے اور بو قلموں بھی۔
(۲) خطوں میں رسمی نیکیوں کا خیال ہوتا ہے نہ کمزوریوں سے ڈرلگتا ہے۔ ان کی فضا میں ایک قسم کی پرسکون اناد کی ہوتی ہے اس لئے مکتوب نگار نادان بچوں کی طرح نہ صرف اپنے اوپر اعتماد رکھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اعتماد کے لائق سمجھتا ہے اس طرح وہ "شخص" سے "شخصی" بن جاتا ہے اور اسی خوبی کی بنا پر شبلی، مہدی، غالب اور حالی جیسوں کی تصویریں متحرک ہو جاتی ہیں۔
(۳) اچھے مکتوب بے ارادہ لکھے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت کم ادبی شخصیتیں اچھے خط لکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔
تدریجی ارتقاء:
(مغرب میں)
جدید ادبی تحقیقات نے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچادیا ہے کہ دنیائے ادب میں مکتوب نگاری کو سب سے پہلے شاہان روم نے اپنی سرپرستی سے نوازا۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ مکتوب نگاری کی افزائش کیلئے "وسیع معاشرت" اور "باقاعدہ حکومت" کا وجود بھی لازم آتا ہے۔ ان کے علاوہ یہ بھی ایک شرط ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے مربوط ہونے کے امکانات ہوں، عملی زندگی کی نہج اور اس کے نشیب و فراز سے مکمل آگہی ہو اور ایسی زبان کی استعداد حاصل ہو جو نہ محض ادبی خصوصیات کی حامل ہو بلکہ دور و نزدیک بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ پہلی بار ان شرائط کا احترام "رومی معاشرت" میں کیا گیا۔ اسی لئے مکاتیبی ادب کی آفرینش و افزائش کا سہرہ شاہان روم کے سر باندھا جاتا ہے۔
یونانی تہذیب ان شرائط سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہی۔ ان کی تہذیبی اور مجلسی زندگی کی عجیب و غریب نہج، ان کی شہری ریاستوں اور جغرافیائی حد بندیوں نے ان کے دائرہ عمل کو بالکل محدود کر دیا تھا۔ وہ اپنی ان تمام ضروریات کو بالمشافہ پورا کر لیتے تھے جو عام طور پر خطوں کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔
بہر کیف رومی زندگی کا پرتو اور وہاں کی معاشرت کا عکس سسرو کے مکاتیب میں نظر آتا ہے۔ تاہم رومی خطوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ سادگی سے معرّی ہیں اور خطابت سے مزین ان خطوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً تہنیتی خطوط، تعزیتی خطوط، تنبیہی خطوط، اصلاحی (ناصحانہ) وغیرہ۔ ان کے علاوہ سرکاری فرامین و رقعات بھی ہیں اور ان سب کے آداب و القاب، مضامین کا انداز ابتدا و انتہا کے اسالیب وغیرہ مقرر تھے اور ان میں بلاغت کے تمام زیورات قربان کئے جاتے تھے۔
انگریزی زبان میں مکاتیبی ادب کا دور پندرھویں صدی میں شروع ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحریک احیائے علوم ایک لحاظ سے مکتوب نگاری کا بھی نشاۃ الثانیہ ہے۔ اس تحریک سے قبل کی خطوط نگاری رقعات و مراسلات کی صورت میں ہے جہاں الفاظ کے ہجوم اور ترکیبوں کے اژدہام میں بقول کسے "دوشیزہ معنی" کی تلاش امریکہ کی تلاش سے کم مصیبت خیز نہ تھی "نشاۃ الثانیہ کے آغاز میں اس فن کے بہت سے امام موجود تھے مگر انکے اصلاحی، تہذیبی اور مذہبی رنگ کی وجہ سے کی وجہ سے خطوں کے ہر ورق سے کفن و کافور کی بو آتی ہے۔ البتہ سترھویں صدی میں اطالوی مکاتیب کے تراجم شائع ہوئے مگر افسوس وہ بھی انگریزی اسلوب مکتوب نگاری کو متاثر نہ کر پائے۔ بہر حال جدید مکتوب نگاری کا باوا آدم اسی زمانے میں پیدا ہوا اور اس کا نام ہے: جیمز ہاول — گو اس کے فن پر بھی متداول اسالیب حاوی تھے۔

البتہ جون پیر نگٹن کے خطوط بے شک مہ رانی اہتمام آرائیوں سے پاکیزہ ہیں اور اس کے خطوں میں بلاغت کی چاشنی کم ہے اور زندگی کی چاشنی زیادہ۔ اس کے بعد ایک تیباتی پسند شاعر کا نمبر آتا ہے۔ مکتوب نگاری اس کے چند مشاغل میں سے ایک ہے۔ "گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے قلم سے نکل کر گیت بن جاتی ہیں"۔ یہ ولیم کاؤپر ہے — اس کے بعد ایک اور مکتوب نگار آتا ہے وہ بھی حسن اتفاق سے شاعر ہے۔ اس کے خطوط میں "طبعی نفاست، ادبی ذوق اور گہری انسانیت جھلکی پڑتی ہے" نام ہے ٹامس گرے۔ ایک خاتون کا نام بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ اس نے خطوط اپنی بیٹی کے نام لکھے اور اس میں بچوں کی تربیت کیلئے گراں قدر نکات موجود ہیں۔ یہ خاتون ہے ملکہ وکٹوریہ —

رومانٹی سیزم کے دور میں چارلس لیمب کے خطوط اس کے مضامین کی طرح ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ "اس کے مزاج میں خفیف سی افسردگی ہے، اسلوب سبک، جیسا ہے اور رومانیت ہے جو دنیا کو پراسرار بناتی ہے"

اس کے بعد کیٹس نے خطوط میں شیلی اور بائرن کے مکاتیب ہیں، سیاستدانوں، نقادوں اور مذہبی پیشواؤں کے کارنامے ہیں لیکن جو ربط اور وحدت کیٹس نے خطوط میں ہے وہ ان لوگوں میں عنقا ہے۔

بہر حال مذکورہ تاریخی جائزے سے چند باتیں معلوم ہوئیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) مغرب میں مکتوب نگاری کی باضابطہ ابتدا سسرو کے زمانے سے ہوئی۔

(۲) ابتدائی دور میں فن طباعت نگاری نے فن مکتوب نگاری کی سلاست و سادگی کو مجروح کیا۔

(۳) انگلستان میں ذوق مکتوب نگاری کا سلسلہ اطالوی مکاتیب کے ترجموں سے شروع ہوا۔

(۴) اس زمانے کی مکتوب نگاری زیادہ تر ان لوگوں کی کاوشوں سے رونق پاتی ہے جن کی زندگی علمی و عقلی تھی جو عملی زندگی کے اسرار و رموز سے واقف ضرور تھے مگر ان کے عامل نہ تھے۔ ان کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔

(۵) دنیا کے بہترین خطوط خواتین نے لکھے یا شعراء نے

(۶) مغربی دنیا میں خطوط کی نثر کے نمونے ان خالقین ادب کے یہاں ملتے ہیں۔

(الف) لاطینی زبان — ہوریس اور سسرو وغیرہ

(ب) انگریزی زبان — ملٹن، بیکن، ولیم کاؤپر، گولڈ اسمتھ، بائرن، شیلی، ٹامس گرے، لارڈ چسٹر فیلڈ اور ملکہ وکٹوریہ وغیرہ

(ج) فرانسیسی زبان — والٹیر، ڈیڈرو وغیرہ۔

(مشرق میں)

اردو مکتوب نگاری کا تاریخی جائزہ لینا مقصود ہو تو عربی اور فارسی زبانوں میں فن خط نویسی کے ارتقائی مدارج کا تجزیہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کا رشتہ نسب فارسی اور اس کی وساطت سے عربی تک پہونچتا ہے۔

عربی مکتوب نگاری:

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دور میں اس فن نے بڑی ترقی کی، زمانہ نبوت ہی میں خطوں کی حفاظت اور ان کی نگہداشت کا کام

شروع ہو گیا تھا۔ قدیم خطوط یا تو شاہی احکامات کی شکل میں تھے یا مذہبی پیشواؤں کے ہدایت ناموں کی صورت میں، دعوت اسلامی کی خاطر جو خطوط روانہ کئے جاتے تھے انہیں وہی صحابہ تحریر فرماتے تھے جو فن انشاء پردازی کے مستند ماہر مانے جاتے تھے۔ حضرت خلیفہ عمرؓ نے مکتوب نگاری کی ضرورت اور افادیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک مستقل محکمہ انشاء کی بنیاد ڈالی تھی۔ خلافت امیہ اور خلافت عباسیہ نے اس محکمہ کو اور بھی مستحکم بنایا۔ فنی طور پر خط کی اصطلاحی تعریفیں کی گئیں اور اس کی قسموں کا تعین کیا گیا۔ صابی، صاحب اور عماد سے لیکر ابن عبدالکریم تک بیسیوں انشاء پردازوں کے خطوط اور مراسلے عربی مکتوب نگاری کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ہلاکو کی چنگیزیت، حکومت بغداد اور خلافت عباسیہ کے اختتام پر اسلامی ایشیا میں منگولوں ((مغلوں) کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اب فارسی زبان دفتری زبان بن گئی جسے حکومت و قت کی پشت پناہی اور سرپرستی حاصل ہوئی۔——

فارسی مکتوب نگاری:——

قابل افتخار بات یہ ہے کہ فارسی میں مکتوب نگاری کی جس قدر خدمت ہندوستان نے کی، خود ایران نہ کر سکا۔ مکاتیب کے وہ نمونے جو فارسی زبان کی روح رواں ہیں، انہیں ایران کی نہیں بلکہ ہندوستان کی سرزمین نے پیدا کیا ہے۔ ان میں حکماء کے رقعات کے علاوہ صوفیاء اور علماء اور دوسرے بزرگوں اور درویشوں کے بہت سے نجی خطوط ہیں جن کا آہنگ وہی ہے جو حکومت کے رقعات کا تھا۔ موجودہ صدی سے پہلے تک پڑھے لکھے ہندو مسلم گھرانوں میں خط و کتابت فارسی زبان ہی میں ہوتی تھی جن کی نشانیاں آج بھی تہنیت ناموں اور تعزیت ناموں میں نظر آتی ہے۔

فارسی (عربی کے بھی) کے خطوط کی کچھ خصوصیات تھیں جنہیں مکتوب نگاری کے لوازم قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) چونکہ اس فن نے حکومت وقت کے زیر سایہ افزائش کی منزلیں سرکیں اسی لئے شاہی کاتبوں، مکتوب نگاروں اور دوسرے محرر خاص خیال رکھتے تھے کہ خط کی مجموعی فضا میں سلیقہ، عظمت و جاہت اور متانت اور مستقل رکھ رکھاؤ موجود ہو اور یوں درپردہ مکتوب الیہ غیر معمولی انداز سے متاثر ہو۔

(ب) چونکہ ان خطوں میں حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ان میں گراں قدر مگر بوجھل تکلف در آتا تھا۔ سادگی، پرکاری، سلاست اور بے ساختگی کا دور دور تک پتہ نہ چلتا تھا۔

(ج) بلاشبہ زبان کی فصاحت اور اسلوب نگارش کے حسن نے ان خطوں کی ادبی افادیت کو بہت زیادہ تقویت دی ہے۔

(د) شاہی خطوط بسیار نویسی کا لاجواب نتیجہ ہیں

(ہ) ان خطوط میں نفس مضمون کی حیثیت تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ ہوتی تھی تاہم مکتوب نگار کو اپنی لیاقت و قابلیت کے جوہر دکھانے کے لاجواب مواقع ملتے تھے۔ انہوں نے مقفٰی و مسجع عبارتوں، روح افزا تشبیہوں اور حیرت ناک استعاروں کی مدد سے اپنے ادبی کمالات خاطر خواہ کامیابی سے ظاہر کئے۔

(و) ان شاہی خطوں میں آداب و القابات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور یہ اکثر وبیشتر طویل ہوتے تھے۔ یہ رنگ و آہنگ نجی خطوط میں بھی نظر آتا ہے جہاں ہر رشتہ دار اور ہر حیثیت کے عزیز کیلئے جدا جدا القاب مقرر کئے گئے تھے۔ (و) ان شاہی خطوں میں آداب و القابات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور یہ اکثر وبیشتر طویل ہوتے تھے۔ یہ رنگ و آہنگ نجی خطوط میں بھی نظر آتا ہے

جہاں ہر رشتہ دار اور ہر حیثیت کے عزیز کیلئے جدا جدا القاب مقرر کئے گئے تھے۔

(ز) پنج رقعہ، رقعات ابوالفضل، رقعات عالمگیری، انشائے خلیفہ، انشائے مادھورام، انشائے فائق، انشائے منیر، بہار عجم، وغیرہ فارسی مکاتیب کے وہ مجموعے ہیں جو ہندوستان میں عالم وجود میں آئے۔ یہ مجموعے ایک عرصے تک ہندوستانی درس گاہوں میں زیر مطالعہ رہے اور جب تک تعلیم یافتہ خاندانوں میں خط و کتابت فارسی زبان میں ہوتی رہی ان کا رنگ جھلکتا رہا اور جب اردو مکتوب نگاری کا آغاز ہوا تو انہوں نے اس پر بھی اپنا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔

اردو مکتوب نگاری:———

(ما قبل غالب)۔۔

اردو میں فن مکتوب نگاری کو سرکاری یا مذہبی سرپرستی میسر نہ آئی۔ انگریزی عملداری میں ایک مختصر عرصے کیلئے اردو نیم سرکاری زبان ضرور رہی مگر خط و کتابت اکثر غیر ملکی زبان (فارسی) میں ہوتی تھی۔ حیدرآباد میں اسے کامل سرکاری پشت پناہی حاصل ہوئی مگر وہاں سے خط و کتابت آداب دربار، سلیقہ و مرتبہ، حفظ مراتب کے تکلفات میں گھر کر فارسی زبان کے نقش قدم پر چل نکلی۔ ان خطوط کے بیشتر حصے خالصتاً عربی و فارسی ترکیبات سے مملو اور گراں بار نظر آتے ہیں اور گو ان خطوں کا تاریخی سلسلہ غالب کے بعد شروع ہوتا ہے مگر فنی اعتبار سے یہ خط غالب کے قبل کے دور کے زیادہ قریب ہیں۔ شاہانہ آمریت کی علامتیں ملاحظہ ہوں۔—

طویل القابات، مختصر سی اور اس مختصریات کے اظہار کے لئے میلوں لمبے تعارفی، تعریفی اور تکلفاتی جملے اور فقرے دراصل یہ روش ان خطوط کی تھی جو غالب کی انقلاب انگیز تحریک سے قبل عالم وجود میں آئے تھے۔

دراصل فارسی خطوط ایک معیار بن چکے تھے۔ اردو کے مکتوب نگاروں نے فارسی مکاتیب سے کما حقہ فیض پایا اور فارسی زبان کی اس تقلید کا انجام یہ ہوا کہ اردو مکاتیب میں مشکل پسندی اور بسیار نویسی لازمی اجزا بن گئے اور اس کے اسلوب بیان کی پوری نقل اتار ڈالی۔ صنائع بدائع کی دکان چمک اٹھی۔ مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی ٹکسالی سکہ بن گئی۔ تشبیہات اور استعارات کی یلغار نے عروس مفہوم کی صورت مسخ کر ڈالی۔ بے تکی لفاظی، واہیات قافیہ پیمائی اور شان فصاحت کو نمایاں کرنا ایک عام وطیرہ بن گیا۔ بعید از قیاس کنایوں اور استعاروں کی بن آئی۔ مبالغہ آرائی پسندیدہ وطیرہ بن گئی اور رنگینی بیان کی عدم موجودگی مکتوب نگار کو "ساقط المعیار" قرار دینے کیلئے کافی تھی۔ اردو کے اس مخصوص انداز کی مکتوب نگاری کے چند اور لوازم بھی تھے مثلاً خیریت گوئی، خیریت طلبی، سارے خاندان کے افراد کی طرف سے مکتوب الیہ کے تمام خاندان بلکہ محلے والوں کے نام فرداً فرداً علیک سلیک، سلام دعا وغیرہ، موسم کا حال لکھ، دعائیں لکھ، ہدایتیں اور لکھ تاکیدیں وغیرہ۔ اس قماش کی مکتوب نگاری کے مستند مگر نادر مجموعے آج بھی کہیں کہیں کباڑیوں کے یہاں دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں "رقعات عنایت علی" "انشائے اردو" "مکتوبات محمدی" "انشائے خرد افروز" خاص طور پر اہم ہیں۔

قدیم اردو مکتوب نگاری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) اپنے ایک دوست کے والد ماجد کے انتقال پر ملال پر مولوی غلام امام شہید کا القاب دیکھئے

"محمود انشاء و شیریں بیانی، دیباچہ کتب سخن معانی"

(ب) گذشتہ صدی کا ایک طالب علم چھٹی کی درخواست کا آغاز اس طرح کرتا ہے

''بحضور فیض گنجور، محترم و مکرم جناب صدر مدرس صاحب.....دام ظلکم'' وغیرہ۔

(ج) ایک دختر نیک اختر اپنے والد صاحب کو یوں خط لکھتی ہے،

''محترم، مکرم، معظم، قبلہ و کعبہ جناب والد صاحب دام اقبالہٗ

بعد ادائے آداب و نیاز مندی کے گزارش ہے'' وغیرہ

قدیم خطوں میں تسلسل نام کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی اور نہ کہیں ترتیب کا احترام کیا جاتا تھا۔ ملا رموزی (گلابی اردو کے موجد و خاتم) نے اس مخصوص کمزوری کا مذاق کچھ اس طرح سے اڑایا ہے۔

''امید کہ آں محترم مع الخیر ہوں گے اور اس طرف بھی سردی کم ہو گئی۔ خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام دعا اور یہاں بھنڈی خوب یاد آئی یعنی برادر محترم محمد عالم صاحب سے بعد سلام و اشتیاق ملاقات کہہ دیجئے کہ آپ کو بچے بہت یاد کرتے ہیں۔ آخر اس خاموشی کا کیا مطلب؟'' وغیرہ وغیرہ۔

غالب کے زمانے میں خط و کتابت بیشتر فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ تاہم یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ انہوں نے اردو کو ذریعہ مخابرت کب بنایا۔ کوئی ۱۸۵۰ء کہتا ہے تو کوئی ۱۸۴۸ء اور کوئی اس سے بھی پہلے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مرزا نے ''اس زمانے میں اردو مکاتبت شروع کی جب فارسی میں ان کی مشاقی اوج کمال پر پہنچ چکی تھی''۔ اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ عبارت میں قدم قدم پر پیچ ڈالنا، نئی نئی ترکیبوں اور نتے نئے استعاروں سے اسے بوجھل بنانا، علم و فضل کی نمائش کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ نفس مضمون ایسے رنگ میں پیش کیا جائے کہ مخاطب اسے بے تکلف سمجھ جائے۔ اس طرح انہوں نے اپنے انداز مکتوب نگاری میں ''سہل ممتنع'' کی کیفیت پیدا کر دی۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ مرزا اردو مکتوب نگاری کی جانب راغب کیوں ہوئے؟ مولانا حالی مرزا کے ایک خط کے جواز میں یہ حکم لگاتے ہیں کہ غالب کو فارسی مکتوب نگاری میں خوب کاوش کرنی پڑتی تھی اور یہ کاوش ان کی تصنیف و تالیف کے کام (خاص طور پر ''مہر نیم روز'' کے تعلق سے) میں حائل ہوتی تھی لیکن دل لگتی بات یہ ہے کہ غالب کی بالغ نظری نے معاشرتی و تہذیبی زاویے سے اردو کے تدریجی فروغ اور فارسی کے سلسلہ وار انحطاط کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر انہوں نے اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کیا۔

مکتوب نگاری کی قدیم روش کی مذمت کرتے ہوئے غالب نے ایک خط میں میر مہدی کو لکھا۔

''تمہارا دماغ چل گیا ہے، لفافے کریدا کرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں، یہاں خیریت ہے وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا.... ہائے کیا اچھا شیوہ کہ جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں، چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے، ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو، تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں، امر ضروری کو لکھ دیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا''

بہر کیف مرزا نے جب اردو مکتوب نگاری کا آغاز کیا تو اس سے پہلے اردو نثر کے دو مستقل اسلوب تھے۔ ایک سادہ اور عام فہم اسلوب جس کی مثال میں فورٹ ولیم کالج کی کتابیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ویسے ۱۸۰۷ء میں انشاء اللہ خان انشاء نے ''دریائے لطافت'' لکھی جس کا انداز نگارش نہایت سلیس تھا۔

دوسرا اسلوب تھا: مقفیٰ و مسجع نگاری اور مغلق بیانی کا جو فارسی کے اس اسلوب کا مظہر تو تھا جو صدیوں سے ہندوستان میں رائج تھا۔ جہاں ابہام و تفہیم سے کہیں بڑھ کر نمائش علمیت کو دخل تھا۔ مکتوب نگاری میں غالب نے اول الذکر اسلوب اختیار کیا اور اپنی نکتہ وری، سادگی اور سلاست کے جوہروں سے ایسے گوناگوں محاسن پیدا کر دئیے کہ ان کی ہمہ گیری کی مثال آج تک کوئی اور مکتوب نگار پیش نہ کر سکا۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ابتدا میں خود مرزا کو اپنے دل پذیر انداز کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ نہ تھا۔ منشی شیو نرائن آرام اکبر آبادی آپ کے خطوط شائع کرنا چاہتے تھے "انہیں غالب نے لکھا۔

"یہ بھی زائد بات ہے کہ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے، اس کی شہرت میری سخن وری کے شکوہ کے منافی ہے"

تاہم جب فارسی کا دور ختم ہوا اور اردو سرکاری زبان بن کر دفاتر، مدارس اور علمی مجامع میں رواج پا گئی اور ہر طرف سے مدح و ستائش ہونے لگی تو غالب کو اپنے اسلوب تحریر کے انوکھے پن کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنی رائے بدلی۔

اجتہاد غالب:-

مرزا نے قدیم روش کو ترک کر کے جو انداز نگارش اختیار کیا اس میں انہوں نے اپنے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کی پوری پابندی کی جس کی بنا پر غالب کے خطوط درج ذیل اوصاف کے حامل ہیں۔

(۱) ان کے چند خطوط میں قافیہ پیمائی ضرور ہے لیکن باقی سب خطوں میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ مرزا خود اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ اسی خوبی نے ان کے خطوط کو ان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ اس انشائے لطیف نے ان کے خطوں کو شدت و حدت عطا کی ہے۔ ایک خط میں میرن صاحب کا قول نقل کرتے ہیں۔

"کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط آجاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جائے"

ایک خط میں لکھتے ہیں

"مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کرو، ہجر و وصال کے مزے لیا کرو۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں —— "بھائی مجھ میں اور تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، "مکالمہ ہے"

ان کے انداز تحریر کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو لکھتے تھے بے تکلف لکھتے تھے۔ ان کے خطوط کے مطالعے سے یہ گمان نہیں ہوتا کہ انہوں نے الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی تلاش و جستجو میں "کاوش" کی ہے۔ مرزا غالب کے اردو خطوط سراسر "آمد" ہیں آورد سے ان کا دامن یکسر پاک تھا۔ ایک جگہ اپنی بے تکلفی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"بخدا سن ورنگارش این است کہ چو کلک و ورق بہ کف گیرم
مکتوب الیہ را بہ تخیل کہ در خور حالت او است در سر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم۔

القاب و آداب خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو و زائد است"

(۲) جدت ان کے پورے کلام نثر و نظم کی روح رواں ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ہر خط میں مکتوب الیہ کو نئے نئے انداز سے مخاطب کرتے ہیں یہ رنگ زیادہ تر ان خطوں میں نمایاں ہے جو انہوں نے اپنے بے تکلف دوستوں کو لکھے ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام کے بعض خطوں کی ابتدائی عبارتیں ملاحظہ ہوں:

(الف) — بھائی تم سچ کہتے ہو برسر اولاد آدم ہرچہ آید بگزرد

(ب) — برخوردار کامگار، میر مہدی دہلوی۔

(ج) میاں! تم کو پنسن (پینشن) کی کیا جلدی ہے؟

(د) میر مہدی! تم میری عادت کو بھول گئے؟ ماہ رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور میں کیوں رہتا؟

(ز) لو صاحب! یہ تماشا دیکھو

(ح) میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو

(ط) آئیے جناب میر مہدی صاحب دہلوی! بہت دنوں میں آئے کہاں تھے؟

(ی) مار ڈالا تیری جواب طلبی نے!

اسی طرح نواب علاؤالدین خان کے لئے چند خطابات تحریر فرماتے ہیں۔ مرزا علائی، علائی مولائی، میری جان علائی، میری جان غالب مگر جسم سے نکلی ہوئی جان

یہ جدت وہ اپنے نام تک کے لکھنے میں روا فرماتے ہیں۔

خواجہ غوث خان بے خبر کو لکھتے ہیں: قبلہ! آپ کو کبھی یہ خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے؟ علائی کے نام: "تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں، نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے"۔ کہیں فقیری کا رنگ اختیار کر کے اپنے آپ کو غالب علی شاہ لکھتے ہیں۔

اکثر 'نجات کا طالب' غالب تحریر فرماتے ہیں۔

(۳) ان کا ایک نمایاں وصف تو یہی ہے کہ انہوں نے تحریر میں مکالمت کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ یوں بھی حسن تحریر کا کمال یہ ہے کہ خط میں باقاعدہ گفتگو کی شان پیدا ہو جائے۔ مرزا اس وصف میں سب سے منزلوں آگے نکل گئے۔

(۴) مرزا اپنے الفاظ میں ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ فن عکاسی کی تمام جزئیات اس میں سمٹ آتی ہیں۔

میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے، قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ کے کٹہرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف دالان کا جو دروازہ ہے گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔

صبح کے میٹھنے کا مزہ چکھ رہا ہے، تمھیں تعلی ہو گئی ہیں مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے——"
ایک خط میں رام پور پہونچنے اور وہاں کے میٹھے پانی کا ذکر یوں کرتے ہیں——

"آہاہا" میرا پیارا میر مہدی آیا ہے۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو، یہ رام پور ہے، دار السرور ہے، پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شک چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے خیر، اگر یوں ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے، لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا؟

(۵) ڈرامائی منظر کشی میں جزئیات کی اہمیت بہت کم لوگ مانتے ہیں اردو نثر میں "جزئیات نگاری" کا وہی مرتبہ ہے جو اردو نظم میں "مثنوی" کا۔ اس سلسلے میں مرزا نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ تحریر کو نہایت پر لطف بنا دیتا ہے۔ ایسی لاتعداد مثالیں ان کے مکاتیب میں ملتی ہیں۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں شیفتہ کی رہائی پر مرزا مہدی مجروح کو لکھتے ہیں "میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کو پاسبانی پر قناعت نہیں، لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اسے پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے" سفر رام پور کے ضمن میں شہاب الدین ثاقب کو لکھتے ہیں

کباب اس میں ڈال دئے، رات ہو گئی تھی، شراب پی لی۔ کباب کھا لئے، دونوں لڑکوں (باقر علی اور حسین علی) نے ادھر کی کھچڑی پکوائی۔ چار پانچ کے عمل میں وہاں سے چل دیا۔ سورج نکلے مراد آباد کی سرائے میں آ پہنچا، چار پانی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں"

(۶) نکتہ آفرینی بھی ان کے خطوں کی ایک خاص خوبی ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں:
انہوں نے اپنے ایک قطعے میں پیشین گوئی کی تھی کہ وہ ۱۲۷۷ھ میں وفات پا جائیں گے تاہم ایسا نہ ہوا، حالانکہ اسی دوران غدر کا ہنگامہ رونما ہوا، پھر بھی کھیلا تھا۔ اپنی پیشین گوئی کے غلط ہونے کا جواز پیش کرتے ہیں۔
"وبائے عام میں مرنا میرے لئے باعث کسر شان ہے"
مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں: "شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے" شکایات کا رنگ دیکھئے۔
متوسط نے وعدہ کیا تھا کہ ہولی کے بعد پانچ سو روپے مع خلعت ان کی خدمت میں پیش کریگا۔ اور وہ (متوسط) نہ آیا تو اپنے دوست تفتہ کو لکھتے ہیں۔ پھاگن بیت رہا ہے، نہیں معلوم ہولی کس مہینہ میں ہوتی ہے۔ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔
(۷) مرزا اپنے حرف مطلب کیلئے بعض اوقات تلمیحات و تمثیلات نہایت دلکش انداز سے استعمال کرتے ہیں۔
علاء الدین کو ایک خط لکھتے ہیں—— "واللہ تمہارا حال اس ریگستان (ریاست لوہارو) میں بعینہ ایسا ہے جیسا کہ مسلم بن عقیل کا حال کوفہ میں تھا"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو پیراہن (پیراہن یوسفؑ) نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا۔

دلی کی تصویر غدر کے بعد کیا ہوئی، ملاحظہ فرمائیے۔

''اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے، یہ وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم حاصل کیا، یہ وہ دلی نہیں، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے، یہ وہ دلی نہیں جس میں ۵۱ برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے۔

مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود ــــ''

(۸) مرزا کی فطری ظرافت و شوخی کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

اپنی مالی پریشانیوں کے ضمن میں لکھتے ہیں :ــــ

''آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ ہمیشہ اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے''

دراروزہ رکھنے کا ذکر دیکھئے

''دھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب کہتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے''۔ اظہار غم میں ظرافت کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

پھوپھی کے مرنے کی اطلاع دے رہے ہیں

''آپ کو معلوم ہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مر گئے ہیں۔ تین پھوپھیاں، تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں یہ جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے یہ جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے''

(۹) مولوی عبدالحق کا یہ محاکمہ نہایت غور طلب ہے:

''مرزا غالب کے حالات اور کلام پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں مگر کہیں ان کی زندگی اور سیرت کا وہ نقشہ نظر نہیں آتا جو ان کے رقعوں میں ہے۔ ان رقعوں میں اس عجیب و غریب شخص نے اپنی روح بھر دی ہے''

(۱۰) خطوط غالب پر مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں

(الف) یہ خطوط اردو زبان میں گوناگوں اسالیب بیان کا ایک دلکش مرقع ہیں۔

(ب) ان میں غالب کے سوانح حیات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔

(ج) ان میں غالب کے دل و دماغ کی مکمل تصویر خود ان کے موئے قلم سے تیار ہو کر سامنے آگئی ہے۔

(د) غالب نے اپنی سرسری تحریرات میں اپنی ذات اور اپنے ماحول کے متعلق جو معلومات بے مقصد و ارادہ فراہم کر دی ہیں

ان کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے اہل قلم کے مخطوطات میں نظر نہیں آتا۔
(ہ)۔ خطوط غالب کی شراب نوشی، اسراف پسندی، فضول خرچی اور بے وجہ مقروض رہنے کی علت پر خوب روشنی ڈالتے ہیں۔
(و) ان کے بعض خطوں میں (جو عمر کے آخری حصہ میں معرض وجود میں آئے) تملق پیشگی اور خوشامد ریزی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سار اابلا ان کی مالی تنگ دستی کا ہے۔
(ز)۔ خطوط بتاتے ہیں کہ غالب کی شخصیت میں قنوطیت و رجائیت کی برابر کی دخل اندازی تھی لہٰذا ان کے ہاں کسی مخصوص پیغام کی تلاش غالب کی ذات کے ساتھ ظلم و ستم کے مترادف ہوگی۔
(ح) ان خطوں میں زندگی کے تقریباً ہر موضوع پر کہیں سنجیدگی سے اور کہیں ظرافت سے بحثیں ملتی ہیں۔
(ط) ان خطوں کے بارے میں آل احمد سرور کی اس پیش گوئی کو تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے
"ایک زمانہ تھا جب غالب کی شاعری کی مقبولیت اور شہرت کی وجہ سے ان کے خطوط مقبول تھے، زمانہ اپنا مذاق جلد جلد بدل دیتا ہے ناممکن نہیں ہے کہ غالب کے خطوط آئندہ اور بھی مقبول ہوں اور ان کی مقبولیت کی وجہ سے ان کا کلام بے اعتنائی سے بچ جائے"

مابعد غالب:۔

اردو مکتوب نگاری میں جس انقلابی تحریک کا آغاز مرزا غالب نے کیا اس نے اپنی افادیت اور کشش کی بدولت اپنے احاطہ اثر کو وسیع سے وسیع تر کیا اور اس کامیاب تجربے کا تتبع ملک کے بعض مشاہیر ادب نے بصد ذوق و شوق کیا۔ چنانچہ مرزا غالب کے بعد جن متعدد شخصیتوں کے خطوط کے مجموعے منظر عام پر آئے ان میں سے چند نہایت اہم اور نمایاں حسب ذیل ہیں۔ سر سید احمد، مولانا محمد علی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد اور ان کے بعد کی نسل میں علامہ اقبال، مہدی حسن افادی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور ان کے بعد کی نسل میں عبدالرحمان بجنوری، نیاز فتحپوری اور آج کے دور میں بہت سے مکتوب نگاروں میں نمایاں ترین صفیہ اختر۔

سر سید کے انداز تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سراپا محبت و خلوص تھے اور اپنے ان جذبات کے اظہار میں تصنع یا ریاکاری سے کام نہ لیتے تھے

وہ ایک سچے محب وطن تھے اور ان کے اس جذبہ کیلئے سفر یورپ نے مہمیز کا کام کیا تھا۔ بہر حال زبان کی سادگی بیان کی روانی مضامین کی ترتیب و تنظیم، مفاہیم کی ادائیگی کا سلیقہ، غم قوم کا نوحہ، مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ، غرض کہ سر سید کی پوری شخصیت اور ان کے مقاصد حیات ان خطوں میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں تاہم ان کی انشائیہ نگاری اور اسلوب بیان دونوں غیر معمولی طور پر متاثر نہیں کرتے انداز نگارش بے شک سہل عظمت کے قریب ہے۔

مولانا محمد علی کی انانیت ان کے خطوط میں مترشح ہے اور ان کی اثبات ذات کی شدت کا نتیجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ ان کے عزیزوں اور دوستوں میں ان کے لئے وہ خلوص پیدا نہ ہو سکا جو ہمیں سر سید کے حلقے کے لوگوں میں نظر آتا ہے۔ استقلال، محبت، خودداری وغیرہ سب کچھ ان کے ہاں ہے مگر افسوس جوش میں آکر مصلحت اندیشی تک کو ترک کر دیتے ہیں۔ جس شخص نے ان کے تصورات کی تردید کی وہ ان کی مخالفت کا نشانہ بنا۔ بے شک وہ صداقت کے اظہار میں کسی قسم کا سمجھوتہ قبول نہ کرتے تھے۔ یہ بھی طے ہے کہ سر سید کی طرح ان کے خطوط بھی انشا اور اسلوب کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

گفتگو کی سی کیفیت ضرور رہتی ہے اور سادگی اور بے ساختگی نے انہیں کافی پر کشش بنادیا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی نے مرزا غالب کی تقلید میں اپنے خطوں میں گفتگو کا انداز پیدا کیا ہے اکثر بلا القاب و تمہید حرف مدعا بیان کرتے ہیں۔ کسی کی عظمت کا احترام کرنا منظور ہوتا تو ایک آدھ لفظ رسماً القاب کا لکھ دیا اور بس، تاہم غالب کے ڈرامائی انداز کے تتبع میں شبلی لطف بیان اور دل بستگی کے سامان کا وہ معیار قائم نہ رکھ سکے جو غالب نے قائم کیا تھا چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ رنگ غالب اختیار کرنے میں شبلی کو قدرے تکلف اور کاوش سے کام لینا پڑتا تھا۔ دراصل یہ تکلف و تصنع شبلی کے خطوں کے نمایاں نشان بن کے رہ گئے ہیں۔ ویسے ان کے خطوں میں مزاح اور شوخی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ مہدی افادی نے بالکل درست کہا ہے "علامانہ سنجیدگی کے ساتھ ان کی حکیمانہ شوخیاں سرمایہ ادب ہوتی ہیں" لیکن یہ بھی درست ہے کہ بقول مہدی: "وہ خطوں میں بہت کم کھلتے ہیں" ان کے خطوں میں علمی و اجتماعی پہلوؤں کے علاوہ زندگی کے دوسرے گوشے نہایت دھندلے نظر آتے ہیں۔ عطیہ بیگم فیضی کے نام خطوط دبی زبان سے گویا ہیں کہ مولانا کی فطرت بڑی جذباتی تھی، ان کے خطوں میں محبت، خلوص اور لطف بیانی کی چاشنی تو ملتی ہی ہے ان کے گوناگوں خیالات کا علم بھی ہوتا ہے اور اس طرح فنِ موسیقی، تعلیم نسواں اور بے پردگی کے بارے میں ان کے خیالات کافی غور افروز ہیں۔ یہ طے ہے کہ ان کی فطرت میں اثبات ذات کا جذبہ بڑا شدید تھا اور اس نے ہی شبلی کو شبلی بنایا۔

مولانا الطاف حسین حالی کے خطوط پاکیزہ اخلاق، ہمدردی اور بے مثال خلوص کا مرقع ہیں اور یہ خطوط ان کی شخصیت کے سچے آئینہ دار ہیں، ان میں سادگی اور بے تکلفی ہے، کہیں کہیں ادیبانہ شان کے جملے اور فقرے ہیں اور اگر کچھ نہیں ہے تو وہ ہے اسلوب کی جدت، انشا پردازی کی صنعت گری یا انداز بیان اور طرزادا کی شوخیاں، ویسے ان کے ایک ایک لفظ سے محبت، شفقت، انکسار اور فروتنی ٹپکتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بجا فرمایا: "ان میں اپنے زمانے کے ادیبوں سے جو بات امتیازی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے ان کی انکساری اور فروتنی، حالی نے شبلی کی طرح اپنے استاد معنوی غالب کے خطوط کی تقلید نہیں کی مگر وہ خطوں سے ملاقات کا لطف حاصل کرنے کے اتنے ہی قائل تھے جتنا کہ کوئی دوسرا ہوتا۔ حالی ایک بلند پایہ ادیب تھے اس لئے ان کے خطوں میں کہیں کہیں بڑے شگفتہ قسم کے جملے آگئے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کی سب سے بڑی ادیبانہ خصوصیت تھی ان کا فنکارانہ خلوص، انہیں اپنے فن سے غیر معمولی عشق تھا اور وہ اپنی فرصت کا ہر لمحہ اپنے تخلیقی کاموں میں سنوارنے میں گزارتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کی کسی نے پذیرائی نہ کی۔ سوائے حکومت پنجاب کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی کے۔ ویسے انہوں نے اپنے ادبی و لسانی کمالات سے مادّی مفاد حاصل کرنے کی کوشش تک نہ کی۔ بس ان کی ایک ہی آرزو رہتی تھی اور وہ یہ کہ انہیں اپنے تصنیف و تالیف کے کام کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت میسر آئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "اچھا مجھے پنشن بھی دیں گے تو قناعت کروں گا اور تصنیفات کو پورا کروں گا۔ اپنے لخت جگر بچوں کو نیم جان تڑپتا نہ چھوڑوں گا" افسوس ان کے خطوں میں وہ بے تکلفی اور بے ساختگی نظر نہیں آتی جو گفتگو کی کیفیت سے آراستہ ہو اور جسے مکتوب نگاری کا خاص زیور سمجھا جاتا ہے۔ تاہم لسانی شیرینی اور ادبی رنگینی (جو ان کے اسلوب کا طرہ امتیاز ہے) ان کے خطوں کو بھی ادبی چاشنی سے مملو کردیتی ہے اور ان کے خطوں کی ادبی قدر و قیمت کا پتہ دیتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط، اردو مکتوب نویسی میں ایک نئی صنعت کا اضافہ ہیں۔ یہ خط انہوں نے اپنے صاحبزادے میاں بشیر کے نام لکھے ہیں وہ اپنے صاحبزادے کے اوضاع و اطوار سے ناخوش تھے۔ چنانچہ ان خطوں میں شفقت، محبت، تربیت اور تنبیہ ہے۔ ان خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اکثر اعزا و اقارب ان کی بخالت اور کنجوسی کی عادت سے نالاں تھے۔ اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ وہ سود تک وصول کرنا روا سمجھتے تھے۔ تاہم یہ خطوط ان کی بے تکلفی، برجستگی اور بے ساختگی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان سے ان کے کردار کے بہت سے گوشے روشنی میں آتے ہیں۔ آپ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اپنے خطوط کو ذریعہ تعلیم و تربیت بنایا۔

علامہ اقبال کی شخصیت کو ان کے فنی کمالات کے تحت سمجھنا بہت دشوار ہے۔ کہ انہوں نے اپنے اوپر لاتعداد پردے ڈال رکھے ہیں۔ جن نقادوں نے اقبال کی شخصیت کا اندازہ ان کے کلام سے لگانا چاہا وہ اکثر ناکام رہے۔ البتہ خط ان کی زندگی کا حقیقی آئینہ ہیں۔ اس کمزوری کا خود ان کو احساس تھا اور وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے دل و دماغ کی ایک مختصر سی سرگزشت تحریر فرماتے مگر افسوس یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ اقبال کے خطوط سے ان کے علوم اسلامیہ سے شغف، مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف، زندگی اور ادب کے مسائل پر تصورات، ان کی اپنی وسیع معلومات اور ان کے علمی تجسس کا پتہ چلتا ہے ان کی تنقیدی صلاحیت، ترقی پذیر فنی شعور اور ادراک، دقت نظر اور اسالیب بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے واقفیت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوں میں انہوں نے اس امر پر خاص طور پر غور فرمایا ہے کہ زندگی کے نئے نظام میں "مذہبیت" کس حد تک باقی رہ سکتی ہے۔ کیونکہ ان کی تمام تحقیق اور ان کے تمام تر تجسس کا مرکز اسی نئے معاشرتی نظام کی تلاش رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم علمی ذخیروں کو خضر راہ بنا کر جدید معاشرتی نظریات پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔ انسانی رویے سے وہ ایک نہایت وسیع القلب انسان تھے۔ ہم عصر علماء، ادباء یا شعراء سے چشمک زنی کا اشارہ تک ان کے ہاں نہیں ملتا۔ البتہ ایک خط میں انہوں نے عبدالحمید صاحب کو لکھا

"یہ کوئی صاحب جنھوں نے شملہ سے میری غزل کی اصلاح کر کے ارسال کرتے ہیں۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے اور عرض کیجئے کہ بہتر ہو اگر آپ میر اور داغ کی اصلاح کیا کریں۔ مجھ گمنام کی اصلاح کر کے آپ کی شہرت نہ ہوگی۔ میرے بے گناہ اشعار کو جو حضرت نے تیغ قلم سے مجروح کیا ہے اس کا صلہ انہیں خدا سے ملے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کو عقل و فہم عطا کرے۔ میں نے یہ دو حرف محض از راہ ہمدردی تحریر کئے۔ مجھے امید ہے کہ برا نہ سمجھیں گے۔ اکثر انسانوں کو کنج تنہائی میں بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ ان کا قصور نہیں، فطرت انسانی ہی اس قسم کی ہے"

اقبال اپنے خطوط میں محققین کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کہیں ظہور الدین مہجور کو کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کرتے ہیں اور کہیں نصیر الدین ہاشمی کو یورپ میں دکھنی مخطوطات' اور 'دکن میں اردو جیسی کتابیں مرتب کرنے پر داد دیتے ہیں۔ وہ ایک قانع انسان تھے۔ انہوں نے راس مسعود کے نام چند خطوں میں اپنی مالی دقتوں کا ذکر کیا ہے اور کسی اور جگہ ہرگز نہیں۔ آل احمد سرور فرماتے ہیں۔

"(اقبال کے) ان خطوں کی خالص انشاء یا اسلوب کے لحاظ سے بڑی اہمیت نہیں ہے اس لحاظ سے یہ غالب کے خطوط کے برابر نہیں،

مگر ان سے غالب کے خطوں سے کم معلومات شاعر کے متعلق نہیں ملتیں اور یہ ان کے صاف، واضح اور آئینہ کی طرح روشن ذہن کی اچھی تصویریں ہیں''

کہاجاتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے خطوں کے ذریعے مکالمے کا لطف اٹھانے اور فراق میں وصال کے مزے لینے کے گر سے اتنا ہی واقف تھے جتنا کہ مرزا غالب یا شاید ان سے بھی زیادہ۔ مولانا کا انداز مخاطبت بلاشبہ نرالا اور انوکھا ہے۔ بذلہ سنجی، ظرافت، شوخی اور خوش طبعی مولانا آزاد اور مرزا غالب کے یہاں مشترک ہیں پھر عام ڈگر سے الگ ہٹ کر نیا راستہ تلاش کرنے کی آرزو آزاد کے ہاں ویسی ہی ہے جیسی کہ غالب کے ہاں۔

ان کے خطوں کا مجموعہ ''غبار خاطر'' کے نام سے شائع ہوا ہے انہوں نے یہ خطوط قلعہ احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں اپنے صدیق مکرم (مولوی حبیب الرحمان شیروانی) کے نام لکھے تھے۔ یہ خط سپرد ڈاک نہ کئے گئے خود شیروانی صاحب کو علم تھا کہ ان کے نام پر خطوط لکھے جا رہے ہیں۔ محض ذوق تکلم کی تسکین کیلئے۔ تاہم بعض ناقدین ان خطوں کو انشائیے قرار دیتے ہیں۔ ویسے یہ خطوط ان تصویروں سے آراستہ ہیں جن میں ہمارے سیاسی رہنماؤں کی اسیری کی زندگی مترشح ہوتی ہے۔ ان کے وہاں طرز معاشرت اور دیگر سامان دل بستگی کی خبریں ملتی ہیں۔ غبار خاطر، میں یہ زندگی متحرک دکھائی دیتی ہے۔ ان خطوں کے بعض حصے ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ناقدین ان پر انشائیوں کا لیبل لگاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ہے۔ اسے شاعری منثور کہیے۔ جگہ جگہ فارسی اور اردو کے مناسب حال اشعار مضمون میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ان خطوط سے آزاد کا فلسفہ حیات بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ اس زندگی کے قائل نہیں جو رنج و غم کی لذت سے واقف نہ ہو انہیں زندگی کی معصومیت پسند نہیں، ان خطوط سے مولانا کی شخصیت کے بہت سے نقوش نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسے کہ انہیں اپنی انفرادیت کا گہرا شعور تھا۔ اپنی مخصوص عادتوں سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ سحر خیزی اور ذوق چائے نوشی ان کی انفرادیت کو اور بھی شوخ کر دیتے ہیں۔ اس اسیری کے دوران ان کی رفیقہ حیات کا انتقال ہوا مگر تشویش خاطر کے باوجود انہوں نے اپنے روزانہ کے معمولات میں فرق نہ آنے دیا۔ نہ انہوں نے بیگم صاحبہ سے ملاقات کی اجازت مانگی جو انہیں ہر حالت میں مل جاتی اور نہ اپنے ان اصولوں کو ترک کیا جو انہیں بہت عزیز تھے۔ مولانا ایک خلوت پسند انسان تھے۔ وہ سیاسی اور اجتماعی تقریبات میں محض مجبوری یا ضرورت کے عالم میں شرکت کرتے تھے۔ المختصر ان کے خطوط اردو مکاتیبی ادب میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ''ان میں کہیں ادب و لطافت کی گل کاریاں ہیں، کہیں بذلہ سنجی اور ظرافت کی شوخیاں'' ان خطوط کو انانیتی ادب کا مثالی نمونہ سمجھنا چاہئے۔

چونکہ مہدی الافادی کو ''کاغذات پٹواری'' کی جانچ پڑتال سے فرصت نہ ملی وہ تحقیق ادب کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ تاہم انہوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں کے ذوق ادب کو جلا دینے، انہیں ان کی لغزشوں پر متنبہ کرنے اور ان کے محاسن پر داد دینے کو مقصد حیات بنالیا تھا۔

ان کی بعض تحریریں ان کی بالغ نظری ان کے ذوق سلیم اور ان کی حسن کی حقیقی پرستاری کا مظہر ہیں اور ان کی بنا پر ملک کے چند ادیب ان کی انشا پردازی کا سکہ مانتے ہیں۔ مولانا شبلی نے ان کے ایک مضمون کو دیکھ کر کہا تھا:

"نقوش اشعر العجم کے مولف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے تھا" محمد حسین آزاد کے اندازِ بیان کی لطافت اور طرزِ ادا کی نفاست اور نذیر احمد کی خوش طبعی اور شگفتگی کو اپنے اندازِ نگارش میں سمو لیا تھا۔ ان کی جن لوگوں سے خط و کتابت تھی وہ عموماً اہلِ قلم ادیب و شاعر تھے جن میں حالی، شبلی، ناصر علی دہلوی، عبد الرزاق کانپوری، ریاض خیر آبادی، دلگیر اکبر آبادی، جوش بلگرامی، عبد الماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور عبد الباری ندوی جیسے حضرات شامل تھے۔ وہ ان خطوں میں نہایت خلوص اور ہمدردی کے ساتھ ان کے رشحاتِ قلم پر داد دیتے یا لغزشوں پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ "ان خطوں میں رمزیت، تلمیح اور سنجیدگی میں پوشیدہ منفی شوخیوں کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو غالب کے خطوط کو ماند کرتی ہیں۔" ان کے مکاتیب میں انگریزی ادب کے گہرے نقوش بھی ملتے ہیں اور انہوں نے انگریزی زبان کی روش پر اپنے خطوں کے القاب و آداب کو سہل بنا لیا ہے۔ مثلاً پیارے پیارے جناب اور پیارے بھائی وغیرہ انگریزی القابات کا لفظی ترجمہ ہیں۔ آل احمد سرور نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کا دماغ مشرقی تھا اور دل انگریزی، انہیں انگریزی الفاظ کیلئے اردو مترادفات کے تلاش کرنے کا بڑا شوق تھا۔ "سگریٹ" کیلئے "وسائل دود کش" "ایٹی کیٹ" کیلئے "عوائد رسمیہ" "کلاسکس" کیلئے "ادب العالیہ" "ہنی مون" کیلئے "ماہِ عسل" "ان ڈفرینس" کیلئے "بے رخی" "لپ سروس کے لئے" "وظیفہ لب" ان کی جدت پسندی کی درخشاں مثالیں ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ شوخی و ظرافت کے باب میں وہ اکثر غالب سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ فطرتاً رنگین مزاج، رنگینی پسند ادیب تھے۔ زاہد خشک انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ "ان خطوں میں ہم ایک دوست، ایک شوہر، ایک باپ کا پُر خلوص دل لطیف اور نکتہ خیز تحریر میں لپٹا ہوا پاتے ہیں۔ یہ مہدی کا والہانہ خلوص ہے جس نے ان کے خطوں کو عمرِ جاودانی بخشی ہے۔"

مذکورہ بالا بزرگانِ ادب کی کاوشوں کے علاوہ آج تک نہ جانے کتنے ادیبوں شاعروں، نقادوں، معلموں اور صحافیوں نے مکتوب نگاری کی، بہتوں کے مکاتیب کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے۔ مگر ان میں سے اکثر خطوط روا روی میں، روزانہ کی عام زندگی کے ریلے میں صرف تجارتی یا کاروباری انداز سے لکھے گئے ہیں۔ بہت کم مکتوب نگاروں نے خط نویسی کی بنیادی شرائط کا احترام کیا ہے۔ اور نہ در پردہ ادب و زندگی کی خدمت کی ہے۔ کہیں جارحانہ تنقید یں ہیں، کہیں مبالغانہ تقریظیں، کہیں ثنا و ستائش ہے اور کہیں لعن طعن ہے۔ کہیں دل کے پھپھولے پھوڑے گئے ہیں اور کہیں پرانا حساب بے باک کیا گیا ہے۔ کہیں تملق پیشگی ہے، خوشامد ہے اور نیاز مندی۔ بعض مکتوب نگاروں میں آزادی کے شہید بھی شامل ہیں۔

جنہوں نے قید و بند کی زندگی پر اپنے ظرف اور تعلیمی معیار کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔ تاہم ان خطوں میں کسی تعجب انگیز سانحے، کسی انوکھے واقعے یا کسی حیرتناک تجربے یا کسی اچھوتے رجحان کا دور دور تک ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی اسلوبِ نگارش میں کوئی جدت دکھائی دیتی ہے۔ اکثر خطوط ہنگامی اور وقتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت ان خطوں سے بہتر نہیں جو ایک عام قاری کسی روزنامے کے مدیر کو لکھتا ہے۔

تاہم اس تمام مکتوب نگاروں کی یلغار میں اور ان کے خطوں کی طومار میں ایک مجموعہ ضرور ایسا ہے جو ایک عام قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے اور وہ ہے مرحومہ صفیہ اختر کے نجی اور ذاتی خطوط کا مجموعہ "زیرِ لب" یہ خط انہوں نے اپنے شوہر نامدار جناب جان نثار اختر کو اس زمانے میں لکھے تھے جب وہ بھوپال میں کالج کی ملازمت ترک کر کے بمبئی کی فلمی صنعت میں نغمہ نگار بننے کی غرض سے آئے تھے اور انہیں مرتے دم تک کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔

ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر نہ تھے، انہوں نے جو چند گانے چند چکروں کیلئے لکھے وہ کافی کامیاب ہوئے۔ افسوس یہ ہے کہ ان کا دماغ تجارتی نہ تھا وہ یہاں کے سرمایہ کاروں کو آئینہ میں اتارنے میں اور کسی حد تک ضمیر فروشی میں ناکام رہے اور مرتے دم تک ساحر لدھیانوی کی روٹیاں توڑنے، بوتلیں خالی کرنے اور اس کی کار میں اس کا دم چھلا بن کر گھومنے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ دروغ بر گردن راوی، کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر گانے لکھ کر ساحر کو دے دیا کرتے تھے جو وہ اپنے نام سے فروخت کرتے تھے۔ بہر کیف "زیر لب" کے خطوط ایک مجبور و مدقوق جان نثار بیوی کے خطوط ہیں جو خود موت سے دست و گریباں ہے، جسے بچوں کی تعلیم و پرداخت کی فکر ہے، اپنے شوہر کی کامیابی کی فکر ہے، ماحول سراسر قنوطی ہے مگر راقمہ کے انداز کی رجائیت زندگی سے عشق کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان خطوط میں نہ فنی جدت ہے نہ تکنیکی ندرت اور نہ لسانی خوبیاں ہیں، سامنے کی باتیں ہیں، جذبات کی کھلی تصویر ہے اور اس تصویر کشی میں کہیں عریانیت ہے، کہیں بے باکی ہے، کہیں خلوص میں ڈوبی ہوئی حسرتیں ہیں اور کہیں تشنہ آرزوؤں کا اظہار۔ بیمار ذہنیت کے قاریوں (جن میں دانشور بھی شامل ہیں) کیلئے سامانِ دل بستگی ہے۔ بیمار عورت کی نفسیات کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے اچھا سامانِ تحقیقات موجود ہے۔

فی زمانہ اردو میں ذوقِ مکتوب نگاری قدرے ماند پڑگیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی صاحب کی گوہر افشانی فی الحال ایک دل بہلاوے کی بات ہے، ویسے کہا جا سکتا ہے خطوط اردو اخبارات، رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں، البتہ خطوط کے مجموعے تو گویا عنقا ہو گئے ہیں۔ دراصل اس صورت حال کی ذمہ داری خود مآل و مستقبل اردو سے وابستہ ہے۔ یہ بد نصیب زبان گذشتہ پچاس برسوں سے سلسلہ وار انحطاط و زوال کی نحوست ابتلا سے دوچار ہے۔

اس کے علاوہ اہل اردو کی معاشی و اقتصادی بد حالی بھی ان مجموعوں کی اشاعت میں حائل ہوتی ہے کیونکہ اگر کوئی مکتوب نگار یا اس کا سرپھرا ناشر و طابع زہر کھا کر ایسا مجموعہ شائع کرتا ہے تو اسے کسی قیمت پر یقین نہیں ہوتا کہ وہ اس کتاب کے چند سو نسخے بھی کل ہندوستان کی منڈی میں فروخت کر پائے گا۔ منافع حاصل کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

خاندیش میں اُردو شاعری کی روایت

ڈاکٹر اکبر رحمانی

(مدیر آموزگار - جلگاؤں، مہاراشٹر)

خاندیش پر فاروقیوں نے تقریباً ۲۲۲ سال حکومت کی۔ مغل شہنشاہ اکبر نے ۱۶۰۱ میں خاندیش کو فتح کیا، مغلوں نے قریب ۱۲۰ سال یہاں حکومت کی، بعد ازاں خاندان آصفیہ مع مراٹھوں اور انگریزوں کے زیر نگیں یہ علاقہ رہا۔ مختلف حکمرانوں کے عہد میں خاندیش کی سرحدوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ لیکن زمانہ قدیم میں اس کی سرحد مشرق میں برار، مغرب میں ناسک، شمال میں مالوہ اور جنوب میں پیٹھن تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابتدا میں خاندیش کا دارالخلافہ تھالنیر تھا بعد میں برہانپور ہوا۔ مغلوں کے عہد تک برہانپور خاندیش کا دارالسلطنت تھا۔ ۱۸۱۸ میں خاندیش پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا، انہوں نے ۶۱—۱۸۶۰ میں انتظامی سہولت کے پیش نظر برہانپور کو خاندیش سے الگ کر کے ضلع نیماڑ (مدھیہ پردیش) میں شامل کر دیا لیکن باقی علاقہ جو جلگاؤں اور دھولیہ اضلاع پر مشتمل تھا، خاندیش ہی کہلایا اور آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

خاندیش کی علمی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ میں "برہانپور" کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ (جن کا مزار خلد آباد میں ہے) کے نام پر آباد یہ شہر ابتدا ہی سے روحانیت اور علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں سے رشد و ہدایت کے چشمے جاری ہوئے۔ سیکڑوں بزرگانِ دین اور علمائے کرام نے تشنگانِ علم و روحانیت کی پیاس بجھائی۔ عہد فاروقی کے ایک باکمال محدث شیخ علی متقی برہانپوری سے تو ایک دنیا نے فیض پایا اور آج بھی مدارس و جامعات عربیہ ان کی کتاب کنز العمال سے فیضیاب ہو رہی ہیں۔ ممتاز عالم دین اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں —

"آج اسلامی دنیا پر جن لوگوں کا احسان ہے ان میں شیخ علی متقی بھی ہیں"۔ اسی طرح خاندیش کے ایک ممتاز عالم و فقیہ شیخ نظام الدین برہانپوری کی زیر نگرانی مرتب کی گئی۔ فقہ حنفی کی کتاب فتاویٰ عالمگیری سے آج پوری دنیائے اسلام فیضیاب ہو رہی ہے۔

دربار اکبری کا نورتن، شاعروں کا قدرداں، ہندی اور فارسی کا ممتاز شاعر عبد الرحیم خانخاناں برسوں صوبہ خاندیش کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ اس کی فیاضی اور قدردانی کی وجہ سے سیکڑوں فارسی شعرا ایران، ترکستان اور دیگر علاقوں سے آکر برہانپور جمع ہوگئے تھے ایک عرصہ تک برہانپور میں فارسی شاعری کے چرچے رہے۔ عبد الرحیم خانخاناں کے دربار سے وابستہ فارسی شعرا کا عبد الباقی نہاوندی نے اپنی کتاب مآثر رحیمی میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

خاندیش کے دارالخلافہ برہانپور میں جس اعلیٰ معیار کی فارسی شاعری ہو رہی تھی اس نے ایرانی شعرا کو بھی حیرت زدہ کر دیا تھا چنانچہ ایران کا مشہور شاعر مرزا صائب تبریزی، برہانپور کے فارسی شعرا کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:—

ہزار حیف کہ عراقی و نوعی و سنجر نیند جمع بہ دارالعیار برہانپور
کہ قوت سخن ، لطف طبع می دیدند نمی شدند بہ طبع بلند خود مغرور

یعنی ہزار مرتبہ افسوس کہ ایران کے شعرا عراقی، نوعی اور سنجر دارالعیار برہانپور میں موجود نہیں ہیں ورنہ وہ یہاں کے شعرا کے زور بیان اور ان کی طبیعت کی لطافت کو دیکھتے تو مغرور کبھی اپنی بلند خیالی پر غرور نہ کرتے۔

مرزا صائب کا، برہانپور کو دارالعیار کہنا یہاں کے بلند ادبی ذوق اور شاعری کے اعلیٰ معیار کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے، دارالعیار کا مطلب ہے وہ شہر جو کھرے کھوٹے کی پرکھ رکھتا ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خاندیش میں شعر و سخن کا کیسا اعلیٰ ذوق تھا اور شاعری کی روایت کیسی تابناک تھی۔

خاندیش میں فارسی شاعری کی طرح اردو شاعری کی روایت بھی اتنی ہی پرانی اور ویسی ہی تابناک ہے، اس خطہ میں اردو شاعری کا آغاز پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ معانی سے قریب سو سال پہلے یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ خاندیش کا پہلا اردو شاعر کون تھا؟ اس بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے، کوئی خاندیش کے صوفی شیخ بہاؤالدین باجن کو پہلا شاعر مانتا ہے تو کوئی سعدی دکنی برہانپوری کو، سعدی دکنی کے حالات کے بارے میں قدیم تذکروں میں مختصر معلومات ملتی ہے، اس سے بقول جاوید انصاری شاعر مذکور کے متعلق کوئی خاص رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ نہ ہی اسکے مقام ولادت اور زمانے کا حال تحقیق ہوسکا ہے۔[1] البتہ مولف چمنستان شعرا نے اسکے مدفن کا ذکر کیا ہے اور سعدی کو دکن کا باشندہ بتایا ہے اور اس کے مرقد کو برہانپور کے جوار میں بتایا ہے، صاحب چمنستان شعرا لکھتے ہیں:۔

سعدی از شعرائے سلف دکن است ، زبانش بادوزمرہ دکن آشنا ۔
مرقدش در جوار برہانپور مشہور است''

مبارزالدین رفعت کہتے ہیں کہ سعدی دکنی برہانپور کے قریب سیر پلور (۲) میں مدفون ہیں ان کی تاریخ پیدائش کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے تو انہیں شمالی ہندوستان کا باشندہ بتایا ہے اور بادشاہ اکبر کا معاصر اور تاریخ وفات ۱۰۰۲ لکھی ہے۔ (۳)۔ ان اقوال کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سعدی دکنی کا زمانہ شاہ باجن کے بعد کا ہے۔ اس لحاظ سے خاندیش کا پہلا اردو شاعر ہونے کا شرف شاہ باجن (۷۹۰ھ-۹۱۲ھ) کو حاصل ہے۔

شیخ بہاؤالدین نام، باجن تخلص، خاندیش کے صوفی شاعر تھے۔ خزائن رحمت اللہ کے نام سے فارسی زبان میں ایک نثری تصنیف ان کی یادگار ہے اس کتاب میں ان کے پیر و مرشد شیخ رحمت اللہ کے ارشادات اور ملفوظات تحریر ہیں اور اسی میں جابجا ان کا اردو کلام بھی ملتا ہے، ممتاز محقق حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو، مولوی عبدالحق نے اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں شاہ باجن کا ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی دئے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ فرید نے خزائن رحمت اللہ کو مدون کرکے شائع کیا ہے اور اس میں شاہ باجن کے اردو کلام کی خوبیوں اور لسانی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

باجن کی اردو شاعری کے بارے میں مولوی عبدالحق فرماتے ہیں۔ ''اگرچہ آپ قدما میں سے ہیں اور اسی زبان میں یہ اشعار لکھے ہیں جو اس وقت یعنی چھ سو برس پہلے عام طور پر بولی جاتی تھی لیکن ان اشعار کی زبان بہت صاف اور بعض اشعار کی زبان تو

۱۔ سلک گہر۔ ۲۔ برہانپور سے تقریباً ۱۰ میل (جاوید انصاری کہتے ہیں ۱۳ میل) کے فاصلے پر موضع سیر پلور یا شیر پلور (متعلقہ جاگیر قاضی افضل الرحمن) میں سعدی کا مزار ہے اور یہاں قاضی صاحب موصوف کے اہتمام سے ہر سال شاندار عرس ہوتا ہے (اردو نامہ کراچی۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳)۔ ۳۔ اردوئے قدیم ص ۳۳

بالکل آج کل کی معلوم ہوتی ہے۔"(۴)
بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رائے کس قدر بلیغ ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

باجن دعا خدا اس کی تبولے — کھاوے حلال اور ساچ بولے
باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے — اس تھے ذرجن تھر تھر کانپے
اللہ مش نکوئی ہوئے — اللہ اور جگ اس کا ہووے
من مراد گھر بیٹھے پاوے — اس کو مار نہ سکے کوئے

ہے کوئی پنڈت یہ بات کھاوے
ایسا اجالا کہاں تھی آوے ہو
ہو یہ اندھارا کہاں چھپ جاوے

ان اشعار میں 'ساچ' تھے، سکے اور تھی ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اردو پر گجراتی زبان کے اثرات کا پتہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں

"ان کے اشعار کی زبان نویں صدی ہجری کی زبان ہے اور اس میں اسلامی اور ہندوی اثرات مل جل کر ایک ایسی شکل اختیار کرتے ہیں۔ جو 'گجراتی اردو' کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی اردو شاعری کی پہلی اور قدیم ترین روایت ہے"۔(۵)
اس کا صاف مطلب یہ کہ شاہ باجن نہ صرف خاندیش کے پہلے اردو شاعر ہیں بلکہ اردو کے قدیم کے اولین شاعروں میں بھی آپ کا شمار ہوتا ہے

باجن کی فقیرانہ صداؤں میں بھگتی، شانتی اور پریم کا رس گھلا ہوا ہے جس نے عوام کے دلوں کو فتح کیا۔ انہوں نے اپنا پیغام محبت عوام ہی کی زبان میں عوام تک پہنچایا، انکے کلام میں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی — "مزاج کی ٹھنڈک اور نرمی، فقیرانہ صدا کا لوچ اور لہجہ کی مٹھاس آج بھی بھلی لگتی ہے"۔(۶)

اسطرح خاندیش میں اردو شاعری کا آغاز ایسی صحت مند روایت سے ہوا جس میں اسلامی تصوف اور ہندوی عناصر کا حسین امتزاج تھا اور جس کا پیغام رشتہ محبت میں انسانوں کو جوڑتا تھا۔ آگے چل کر ہندوستان میں مشترکہ کلچر اور قومی یکجہتی کی جو روایت مستحکم ہوئی اس کے لئے سازگار فضا اور ماحول پیدا کرنے میں شاہ باجن اور دیگر صوفی شعرائے خاندیش نے اہم کردار ادا کیا، یہ صحت مند روایت صرف خاندیش تک محدود نہ رہی بلکہ دکن، گجرات اور دہلی تک اسکے اثرات پہنچے۔

حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شاہ سعد اللہ گلشن دہلوی (۷) کو بھی خاندیش کے صوفی شعرا میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ کچھ عرصے وہ برہانپور میں اقامت گزیں رہے۔ ان کے دو شاگرد تھے ۱۔ ولی اورنگ آبادی اور ۲۔ خواجہ ناصر عندلیب دہلوی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہیکہ ولی اکثر برہانپور اپنے پیر سے ملنے آیا کرتے تھے۔ تاریخ ادب میں یہ واقعہ مشہور ہیکہ شاہ سعد اللہ گلشن ہی کی فرمائش پر ولی نے زبان ریختہ میں طبع آزمائی کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند میں بھی ولی کا کلام مقبول ہوا اور وہاں کے شعرائے ریختہ کے رنگ سخن کی پیروی شروع

۴۔ اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ کراچی ۱۹۶۸ء ص ۱۲۳ — ۵۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۱۷۱ دلی ایڈیشن — ۶۔ ایضاً ص ۱۷۳ — ص ۴۳-۴۲ — ۷۔ بمولف شعرائے دکن نے لکھا ہے کہ آپ کی ولادت شہر برہان پور ہی میں واقع ہوئی (ص ۴۶۸)

کروی۔ یہ ایک ایسا انقلابی موڑ تھا جس نے اردو شاعری کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا تھا، اسطرح اردو شاعری کی جدید روایت کے آغاز کا سہرا ملک حد تک برہانپور خاندیش کے سر ہے۔

ممتاز عالم اور محدث شیخ علی متقی برہانپوری اپنے مرشد شاہ باجن کی طرح کبھی کبھی ہندی زبان میں شعر کہتے تھے ایک دوہرہ جو آپ نے مرض الموت میں کہا ہے وہ درج ذیل ہے۔

سن سہیلی پریم کی باتاں یوں مل رہے جیوں دودھ نباتا

مغلوں کے عہد میں خاندیش اور اورنگ آباد دو الگ الگ صوبے تھے مگر دونوں ایک دوسرے کے پڑوس میں ہونے کی وجہ سے شاعروں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ عہد مغلیہ و آصفیہ میں کئی فارسی و اردو شعراء برہانپور سے اورنگ آباد اور اورنگ آباد سے برہانپور آتے جاتے رہے۔ دکنی شعراء کے تذکروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہیکہ دکن کے ممتاز صوفی شاعر سراج اورنگ آبادی اپنے مریدوں اور شاگردوں سے ملنے اکثر برہانپور آتے تھے ان کے شاگردوں میں سے بعض نے اپنے پیر و مرشد کی محبت میں اپنے وطن برہانپور کو چھوڑ کر اورنگ آباد بسالیا تھا۔ ان شاگردوں میں ضیا، پروانہ، منعم، متین، شاہ قاسم کے نام قابل ذکر ہیں لیکن ان شعرا کے دلوں سے اپنے عزیز وطن کی یاد نہ گئی۔ چنانچہ شاہ قاسم فرماتے ہیں

قاسم خجستہ شہر میں سب مہرباں ہیں لیک
پن جن کو جی چاہتا ہے وہ دلدار برہانپور ہیں

بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں خاندیش میں اردو کے جو نامور شاعر ہو گزرے ہیں ان میں سے چند کا کلام ذیل میں دیا جارہا ہے

مرزا ابدال بیگ ابدال:

دل میں جب سیتی تجھ عشق میں مجھ سے جدا ہوا
کھڑکا ، جلا ، موا نہیں معلوم کیا ہوا
کیا بے وفا ہے دل کہ تری یک نگاہ میں
بیگانہ ہو کے مجھ سے ، ترا آشنا ہوا

عاصی برہانپوری (متوفی ۱۱۷۵ھ)

کچھے ہیں ہم کہ اب کہیں تم نے ہی دل دیا
بیٹھے کہیں ہو ، بات کہیں ہے ، نظر کہیں
آتا تھا تیرے منہ کے مقابل ہو آفتاب
ایسا گرا کہ تیغ کہیں اور سپر کہیں

میر یحییٰ عاشق برہانپوری:

جیت میری ہے عشق بازی میں - جب سے دلبر نے مجھ کو ہار دیا -

میں کہا تیرے بدن پر کیا بھلی لگتی ہے راکھ - ہنس کہا جوگی پسر نے خاک لگتی ہے بھلی

میر محمد برہانپوری

اب تو ہر بات میں وہ شوخ اٹک جاتا ہے - بیٹھ کہتا ہوں تو دامن کو جھٹک جاتا ہے -
جب کہ آنکھوں میں خواب آتا ہے - یاد تب بے حجاب آتا ہے

متین برہانپوری (متوفی ۱۱۹۷ھ)

جان جاتا ہے مرا افسوس کوئی کہتا نہیں
آنسوؤں بیٹھے ہو کیا ۔ آنکھوں کے ایواں سے چلو

منصور (متوفی ۱۲۰۳ھ)

بسر کرتے ہیں رقیباں مجھے معلوم ہوا — ان کی قدرت نہیں دلبر کا اشارہ ہوئیگا

مراد (متوفی ۱۲۰۸ھ)

آخرش ملک عدم کو یاں سے جانا ہے ضرور — بیٹھئے بے فکر کیا، چلنے کا ساماں کیجئے

میر دولت علی دولت (متوفی ۱۲۱۰ھ)

ہم کو ہمارے یار کے جلوے سے کام ہے — اے زاہد و بہشت کی تم آرزو کرو
اس عمر کی کشمکش میں روتے ہی عمر گذری — کیا یاد میں کروں گا خوبی سے اس جہاں کو

اس دور کے دیگر مشہور شاعروں میں اعظم برہانپوری، ساحل، قائم، علی نقی، ارشاد، قاسم، پروانہ، عطا، مرزا عاشق، ہمدم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

غزل کے علاوہ خاندیش کے شعرا نے مرثیہ نگاری میں بھی کمال دکھایا۔ ہاشم علی برہانپوری خاندیش کا وہ مرثیہ نگار ہے جسے دکن کا میر انیس کہا جاتا ہے۔ ہاشم علی کے مرثیہ "اصغر کا ماتم" کے دو بند ملاحظہ کیجئے۔

آج پڑھوں کفن ترا اصغر — آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے گلبدن ترا اصغر — حیف یو بال پن ترا اصغر
اٹھ گلے کا لہو دھلاؤں میں — نیند آئی تجھے سلاؤں میں
چل ترا پالنا جھلاؤں میں — حیف یو بال پن ترا اصغر

ہاشم علی اٹھارویں صدی عیسوی کا مقبول مرثیہ نگار تھا۔ اس کے مرثیوں کا مجموعہ دیوان حسینی کے نام سے اڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ ممتاز نقاد پروفیسر مسیح الزماں کہتے ہیں — "انداز بیان کی ندرت، تشبیہوں اور استعاروں کی سجاوٹ سے ہاشم علی نے اپنے مرثیوں کو خوبصورت بنایا ہے۔" (۹)

اس دور کے دوسرے مرثیہ نگاروں میں امامی، اور احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ امامی برہانپوری تو ایسا شاعر تھا جس نے مرثیہ نگاری کے سوا کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔

---

۹ — شمالی ہند میں اردو کے مرثیے کا ارتقا - ڈاکٹر مسیح الزماں

انگریزوں کے عہد میں برہانپور، خاندیش سے الگ ہو کر صوبۂ متوسط (CENTRAL PROVINEE) میں شامل کر دیا گیا تھا۔ لیکن باقی ماندہ علاقہ خاندیش ہی کہلایا اور دھولیہ اس کا ہیڈ کوارٹر مقرر ہوا۔ ۱۹۰۶ میں انتظامی سہولت کے لئے انگریزوں نے پھر خاندیش کو دو اضلاع میں تقسیم کیا۔ ایک مشرقی خاندیش اور دوسرا مغربی خاندیش کہلایا۔ جلگاؤں اور دھولیہ دونوں بالترتیب مشرقی خاندیش اور مغربی خاندیش کے ہیڈ کوارٹر مقرر ہوئے۔

برہانپور کے علاحدہ ہو جانے سے باقی ماندہ خاندیش میں علمی و ادبی سرگرمیوں کی رفتار کچھ حد تک کم ضرور ہوئی لیکن برہانپور کے شعراء کی خاندیش آمد و رفت جاری رہی، صنعت و حرفت اور رسل و رسائل کی ترقی اور تعلیمی بیداری نے اس خطے میں علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ بھساول ریلوے جنکشن بن جانے سے دوسرے صدیوں کے شعراء کی آمد و رفت کا دروازہ کھل گیا۔ خاندیش کے مختلف مقامات پر شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے، طرحی مشاعرے ہونے لگے، جلگاؤں، دھولیہ اور بھساول میں آل انڈیا مشاعروں کا رواج ہوا، ان مشاعروں کے لئے دور دراز کے مشہور شعراء کو مدعو کیا جانے لگا، آل انڈیا مشاعروں، یہاں کے باذوق سامعین اور شعراء کی قدر دانی کی بدولت بھساول اور دھولیہ کا نام پورے ملک میں مشہور ہو گیا۔ ان مشاعروں کی وجہ سے یہاں کے شعراء کا تعلق شمالی ہند کے اساتذہ سے قائم ہوا، چنانچہ خاندیش کے کئی شعراء نے زائر حرم حمید لکھنوی، جانشین داغ حضرت نوح ناروی، جانشین امیر مینائی جلیل مانکپوری، علامہ سیماب اکبر آبادی، محوی صدیقی لکھنوی اور شفا گوالیاری جیسے اساتذہ فن سے استفادہ کیا اور ان کی شاگردی اختیار کی۔

حمید لکھنوی کے تلامذہ میں استاد الشعراء، اطہر جلگانوی اور عبدالرحمن عبد دھولپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ عارج دھولپوری نے جلیل مانکپوری اور عازم دھولپوری اور ناظر انصاری نے محوی صدیقی سے کسب فن کیا، علامہ سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ میں شہادہ کے خاور، شوق، وارث صدیقی اور فردوس انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ خاندیش میں سب سے بڑا حلقہ حضرت نوح ناروی کے شاگردوں کا تھا، اطہر جلگانوی کے شاگردوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اس زمانے میں شعری گلدستے بہت شائع ہوتے تھے، خاندیش کے شعراء کا کلام بھی ان گلدستوں میں چھپنے لگا۔ جس گلدستہ میں خاندیش کے شعراء کا کلام زیادہ شائع ہوا وہ ہے 'جلوہ یار' میرٹھ، خاندیش کے ایک شاعر نے شعری گلدستہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اردو پریس کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا، شعری گلدستہ کا تصور مراٹھی اخبار پربودھ چندریکا کے ایڈیٹر اور باگھی پرنٹنگ پریس کے مالک تاتا صاحب بھڈینس کو اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے ۱۸۸۶ میں مراٹھی شعری گلدستہ کاویہ رتناولی کے نام سے جاری کیا، یہ رسالہ مراٹھی شاعری میں انقلاب لایا، یہ شعری گلدستہ جدید مراٹھی شاعری کا پیش رو ثابت ہوا۔ چند سال پہلے کاویہ رتناولی کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ شائع ہوا ہے جس کے دیباچے میں مراٹھی کے ممتاز نقاد پروفیسر۔ م۔ ن۔ ادونت کاویہ رتناولی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

یعنی اس رسالہ (گلاویہ، ستاولی) کا محرک ایک مسلمان تھا جو اردو میں شعری گلدستہ شائع کرنے کے ارادے سے ناناصاحب سے ملنے آیا تھا اس نے ناناصاحب کو بتایا کہ اس قسم کے شعری گلدستے مختلف شہروں سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ناناصاحب کو شعری گلدستہ کا تصور اچھوتا معلوم ہوا اور انہوں نے سوچا کہ کیا مراٹھی میں ایسا شعری گلدستہ نکالا نہیں جاسکتا؟

مراٹھی شعری گلدستہ کی اشاعت کے چالیس سال بعد دھولیہ سے ۱۹۲۵ میں البدر کے نام سے ایک رسالے کا اجراء ہوا جو شعر و شاعری کے لئے مختص تھا اس رسالے نے خاندیش میں اردو شاعری کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے خاندیش میں آل انڈیا مشاعروں کا انعقاد ہونے لگا۔ ہر سال کبھی بھساول، کبھی دھولیہ اور کبھی برہانپور میں آل انڈیا مشاعرے انعقاد ہوتے تھے۔ جلگاؤں، نندوربار، فیض پور، یاول، ارنڈول، پاچورہ، جامنیرہ، شہادہ اور دیگر شہروں میں بھی چھوٹے بڑے مشاعرے منعقد ہوتے لیکن آل انڈیا مشاعروں کے لئے بھساول اور دھولیہ کو جو ہندوستان گیر شہرت ملی وہ خاندیش کے کسی اور شہر کو نہ ملی۔

ہندوستان کا وہ کون سا بڑا اور مقبول عوام شاعر ہے جس نے ان مشاعروں میں شرکت نہیں کی۔ نوح ناروی، ماہر القادری، ساغر نظامی، فراق گورکھپوری، سیماب اکبرآبادی، ادیب سہارنپوری، علی سردار جعفری، خمار بارہ بنکوی، کیفی اعظمی، شکیل بدایونی، عمران انصاری، جگن ناتھ آزاد، سکندر علی وجد، انار صدیقی، جاں نثار اختر، راز الہ آبادی، انجم فوقی بدایونی، شفا گوالیاری، قاضی سلیم، بشر نواز، مجروح سلطانپوری، ملک زادہ منظور، افتخار امام صدیقی، اور ظفر گورکھپوری کے علاوہ خاندیش اور اس کے قریب و جوار کے علاقوں سے کتنے ہی مقبول شاعروں نے اس خطے کی شعری محفلوں کو زینت بخشی۔ اور اردو شاعری کی ذوق کو پروان چڑھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندیش کے چھوٹے شہروں اور قصبات میں ادبی نشستیں اور طرحی مشاعرے ہونے لگے۔ ذوق شعر و سخن اس قدر بڑھا کہ ہر کوئی (چاہے وہ کم تعلیم یافتہ ہو) شاعر بننے کی کوشش کرنے لگا۔ مشاعروں کی مقبولیت کو دیکھ کر بعض ہندو اور سکھ بھی سخن گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ یہاں کی عوام میں ذوق شاعری اس قدر بڑھا کہ جہاں کہیں آل انڈیا مشاعرہ ہوتا ہزاروں باذوق سامعین شرکت کرتے۔ رات ۱۰ بجے مشاعرہ شروع ہوتا اور صبح موذن کی اذان کے بعد ختم ہوتا۔

خاندیش میں کتابت کی سہولت تھی نہ طباعت کی۔ لیکن اردو شاعری کا ایسا جنون تھا کہ شعرائے کرام سیکڑوں میل دور آگرہ، دہلی، اور میرٹھ سے اپنا مجموعہ کلام اور دیوان چھپوا کر منگاتے تھے۔ آزادی کے بعد بمبئی، بھوپال، برہانپور، مالیگاؤں اور دھولیہ سے شعرائے خاندیش کے مجموعے شائع ہونے لگے، ان علاقوں میں اردو کتابت و طباعت کی سہولت ہونے کی وجہ سے خاندیش میں اردو شعرائے ادب نے تیزی سے ترقی کی۔ اس کا اندازہ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مجموعہ کلام سے کیا جاسکتا ہے جو گذشتہ ۷۰ سال میں خاندیش میں شائع ہوئے۔

یاس نورس (اطہر جلگانوی) چراغ ایماں (ایمان یاولی) غم محرم (اطہر جلگانوی) تفکرات ماہر (ماہر دھولیوی) خیال تاریخ (ناظر انصاری جلگانوی) امر سیل نشاط (شاہدوی) تازیانہ (سید منظور حسن بخاری جلگاؤں) ان کا دل (حکیم حسن نصیر آبادی) کلام احسن (ابوالحسن چشتی) محور (اشعر ملیح آبادی) پیر اقبال (نیر جلگانوی) آئینۂ معرفت (عارف دھولپوری) نقوش جاوداں (اکرم دھولپوری) جوئے رواں (شمس الدین زاہد دھولیوی) جلوۂ راز (کلیم کریمی) راز کہکشاں اور سلک مروین (انجم فوقی بدایونی، دھولیہ) تاثیر جرس (غریب انصاری) خاک آرزو (علیم انصاری شہادوی) پس مرگ (سلطان نقشبندی) آواز (قمر بھساولی) اتفاق (محسن جلگانوی) طائر خیال (عارف القادری املنیری) سیاہ

لمس (صابر زاہد) زخموں کا پیرہن (ماہر نصیر آبادی) ورق ورق (سراج انور مصطفیٰ آبادی) انعکاس (صابر نصیر آبادی) چاک سحر (اثر قادری جہانگری) مضراتِ دل (رہبر جلگانوی) پاش پاش (احسان رسولپوری) شگفتۂ گل (سیف بھاولی) فسون سخن (ساحر ادیبی) لاتقنطو اور نقوش سنگ (نسیم اثر یاولی) ایک سی ترنم (حمید قیصر دھولیوی) ارتکاز (صابر زاہد) بوند بوند لہو (نصرت راویری) نوائے ہاتف (ہاتف عربی دھولیوی) سنگم (رئیس احمد قتیل) جذب احساس (ذاکر عثمانی راویری) بادۂ اطہر (اطہر حنفی دھولیوی) موج نشاط اور روشنی کا سفر (خوشتر بھساولی) لاشعور (نظام الدین نظام) برگ برگ خوشبو (مقیت اعظمی دھولیہ) اقتا (عرفی عدل آبادی)

برہانپور کے کئی جدید شعرا کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں دور جدید (خیالی) میکدہ (ریاض) صدف (خلیق) نشاط فکر (فاضل انصاری) متاع قلم (نسیم اشرفی) نقش دوام (جاوید انصاری) اور شاخ گلاب (نعمت انصاری) قابل ذکر ہیں۔ یہاں ایک اور شاعر فہمی انصاری کا کلام ریاض دانش اور نیر نگ دانش کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے اور بھی شعرا ہیں جن کے مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں مگر ان تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ ابھی چند شاعروں کے مجموعے زیر طبع ہیں۔

ان مجموعوں کے علاوہ شعرائے خاندیش کے کلام انتخاب پر مشتمل مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں پلک پلک تیشہ (مرتبہ صابر زاہد) سخن در سخن (مرتبہ حشمت اللہ انصاری) اور تذکرۂ شعرائے خاندیش (ایم رفیق) قابل ذکر ہیں۔

ان شاعروں کے علاوہ مشرقی و مغربی خاندیش میں ایسے شاعروں کی بڑی تعداد ہے "جلوۂ یار۔ میرٹھ" — "البدر۔ دھولیہ" اور دیگر ادبی رسائل اور گلدستوں میں شائع ہوتا تھا۔ لیکن ان کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوا۔ ان میں سے اکثر اس جہان فانی سے سدھار چکے ہیں۔ آج بھی یہاں شاعروں کی کمی نہیں ہے۔ آئے دن مشاعرے، ادبی نشستیں، طرحی نشستیں اور ادبی مذاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ پورے خاندیش میں جگہ جگہ اردو مدارس قائم ہو چکے ہیں کالجوں میں بھی اردو شعبے قائم ہیں۔ اکثر تعلقہ مقامات پر اردو لائبریریاں قائم ہیں۔ جلگاوں اور دھولیہ سے اردو اخبارات اور رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ آج کے خاندیش میں اردو زبان، ادب اور تعلیم کا ماحول نہایت سازگار ہے۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے معیاری کلام کے مجموعے شائع ہو رہے ہیں اور بعض انعامات سے بھی نوازے جا رہے ہیں۔

خاندیش کے جن قدیم و جدید شعرا نے اردو شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ان میں باطن انصاری، حافظ دھولیوی، غریب انصاری، ماہر انصاری، حنیف دھولیوی، اکرم دھولیوی، پروفیسر افتخار احمد فخر دھولیوی، مختار احسن دھولیوی، فروغ، طائر شفیق، شیدا، رشید صہبائی، ضیاء انصاری، عارف، عازم، شاغل، سعید تحاب، رزاق انور، قیصر، سالک انصاری، انجم، زاہد دھولیوی، ماہر شہادوی، مقیت اعظمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا کا تعلق مغربی خاندیش (دھولیہ ضلع) سے ہے۔

مشرقی خاندیش کے شعراء میں اطہر جلگانوی، ایمان یاولی، کلیم یاولی، قاضی شاہد علی، ارمان املیزی، ارمان مصطفےٰ آبادی، نجمل دھرنگانوی، امام ساودوی، شادار نڈولی، اختر املنیری، سیماب عزمی، عدل آبادی، شاکر جلگانوی، مرزا مصطفےٰ آبادی، اختر جلگانوی، ظاہر بھرگانوی، حافظ بھساولی، قادر بھساولی، کریم اختر، عاشق بھساولی، محتاج نظامی ساودوی، عارف دھرنگاوں، مصطفےٰ آبادی، سلطان نقشبندی، ناظر انصاری، حامد جلگانوی، بدرالدین افسر مصطفےٰ آبادی، گوہر دھرنگاری، خلیق بھساولی، جوہر دھرنگاری، ارمان بھادوی، عزیز مادولوی، کمعہ حیدرآبادی، قادر جلگانوی، خوشتر جلگانوی، نشتر جلگانوی، صابر بھادوی، منظور بخاری، خمار املنیری، محترمہ ساجدہ واحدی اطئیری، ارشد منیا نگری، شاہد لطیف، باشد ادبی، محتاج نظامی ساودوی، عاشق بھساولی، حسن فیض پوری، سیف بھساولی، قمر اعظمی، ماجر یاولی، قمر بھساولی، کیف

بھساولی، اشعر ملیح آبادی، راشد ادیبی جافیری، عزمی عادل آبادی، سحر جلگانوی، مجاہد جلگانوی، شمس اعجاز، نصرت راویری، اکبر شاہین، شوق جلگانوی، عشرت جامبری، افسر بحر گانوی، رزاق پرویز، اسلم تنویر، قیوم اثر، رفیق عادل، سراج انور مصطفی آبادی، محشر مصطفی آبادی، خوشتر بھساولی، احمد کلیم فیض پوری، مبارک بھساولی، ڈاکٹر تنویر عالم، مکش انور، صابر نصیر آبادی، ساحر ادیبی، ذاکر عثمانی راویری، عارف املنیری، اثر مہانگری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس فہرست میں مزید ناموں کا اضافہ ممکن ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ خاندیش میں اردو شاعری تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔

خاندیش کے بیشتر شعراء نے غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بعض شعراء نے نظم نعت، مرثیہ، قطعہ اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں کے شعراء کا کلام کس قدر معیاری اور اس میں کتنی پختگی ہے اور تاثیر پائی جاتی ہے اس کا اندازہ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ رائے ضرور دی جا سکتی ہے کہ بیشتر شعراء کا کلام ناپختہ ہے۔ ان میں فنی کمزوریاں بھی ہیں۔ پرانے شعراء کے کلام کے مطالعہ سے کسی اچھے استاد کی شاگردی اور مشق سخن سے یہ کمزوریاں دور ہو سکتی ہیں۔

خاندیش کے اکثر شعراء روایتی شاعری کر رہے ہیں بہت کم شعراء کے یہاں ندرت اور جدت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند ہی شاعر اپنی انفرادیت اور شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان تمام خامیوں کے باوجود خاندیش میں اردو شاعری کی تاریخ بڑی تابناک رہی ہے اور اس کا مستقبل بھی روشن دکھائی دیتا ہے۔

جدید شعرائے خاندیش کے کلام کا انتخاب۔

(۱) اطہر جلگانوی

آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو چکے — ان کے ہم وہ ہمارے ہو چکے
دفن زیر خاک اے یاران بزم — کیسے کیسے ماہ پارے ہو چکے
قسمت خوابیدہ اطہر جاگ اٹھی — آج وہ مہماں ہمارے ہو چکے

(۲) حافظ عبدالشکور، حافظ دھولیوی

شب غم درد فرقت سے ہی عالم تھا مرے دل کا — کبھی تڑپا، کبھی اچھلا، کبھی رویا، کبھی بلکا
پتنگوں کو جلا کر خود بھی آخر ہو گئی ٹھنڈی — سبق آموز ہے گھل گھل کے مٹنا شمع محفل کا
جو اٹھتا ہے اٹھے طوفاں بحر شعر گوئی میں — سفینہ ہاتھ آیا نوح سے استاد کامل کا

(۳) ایمان بیاولی

تجھ سا نہیں دربار جو شاہا نہ کسی کا — مجھ سا بھی نہیں حال فقیرا نہ کسی کا
ایمان بہت سچ کسی کامل نے کہا ہے — کم ظرف سے نبھتا نہیں یارانہ کسی کا
ایمان ہیں کیوں کافر و دیندار میں جھگڑے — کعبہ ہی کسی کا ہے نہ بت خانہ کسی کا

(۴) حضرت حنیف کرمی دھولیوی

کسی کو معلوم یہ رات کہاں تھی دن بھر — صبح کی نکلی ہوئی شام کو گھر آئی

جناب شیخ کو اس کی بھی لگ گئی خوشبو
نظر بچا کے جو لائے تھے بزم رنداں سے

کہاں ہے اس کا دماغ علم و عرفان سے
ٹپک رہی ہے خرابی نگاہ انساں سے

(۵) سید منظور بخاری امرتسری

حسن جب خود ہر جگہ بدنام ہے
عشق مضطر کیوں موردِ الزام ہے

ہے جوانی صبح ہستی کا طلوع
اور پیری زندگی کی شام ہے

(۶) اشعر ملیح آبادی

زندگی ہے تو جئے جاتے ہیں
ورنہ اب جینے سے گھبراتے ہیں

آپ کیا جانیں کہ خوابوں میں مرے
آپ کب آتے ہیں کب جاتے ہیں

اپنے اجداد کی عشرت کے طفیل
خون دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں

آپ کو مجھ سے تعلق نہ سہی
کیوں میرے ذکر سے شرماتے ہیں

(۷) نشاط شاہدوی

یاد میری سنبھال کر رکھنا
میرا کیا میں رہا، رہا نہ رہا

دعاؤں سے شب دیجور کٹ نہیں سکتی
طلوع مہر کو ظلمت نہ آسرا دے گی

اٹھو قریب کے ہر دوں کو خاک کر ڈالو
نگار صبح اسی چاک سے جنم لے گی

بہار نو نے خزاؤں کے رنگ برسائے
حیات تازہ کے گلشن پہ موت طاری ہے

عروس خواب پڑی ہے نڈھال بستر پر
سحر کے زخم سے تاروں کا خون جاری ہے

(۸) ناظر انصاری

عشق عظمت مقام ہے اب تک
عقل انساں کی خام ہے اب تک

ہے کہاں اب شعور بادہ کشی
فیض ساقی تو عام ہے اب تک

پوچھتے کیا ہو اپنے ناظر کی
میکشوں کا امام ہے اب تک

(۹) اکرم دھولیوی

سینے پہ ہاتھ رکھ کر ذرا دھیان سے کہو
تم جان آرزو نہیں؟ ایمان سے کہو

مریخ و ماہتاب تک اڑنا نہیں گناہ
انسانیت نہ پست ہو، انسان سے کہو

آجائیں وجد میں تو بدل دیں نظام دہر
ہم کون ہیں؟ فقیر ہیں، سلطان سے کہو

(۱۰) سیف بھساولی

یہ بات سوئے ادب ہے کسی سے مت کہنا
جو کرب شب ہمہ شب ہے کسی سے مت کہنا

گزر رہی ہے بہرحال زندگی اپنی
سکون تب تھا نہ اب ہے کسی سے مت کہنا

(۱۱) عزمی عدل آبادی

ہم نے غیرو ں کے بھی سو کام بنائے عزمی
کام اپنا کوئی ہاتھوں سے بنایا نہ گیا

جنگل کی بات چھوڑیئے وہ دور آ گیا
محفوظ اپنے گھر میں بھی انسان اب نہیں

(۱۲) قمر اعظمی بھساولی

اتنی آراستگی نہیں اچھی
چند روزہ حیات فانی میں

دوسروں کو بھی حق ہے جینے کا
کیوں لگاتے ہو آگ پانی میں

(۱۳) مجاہد جلگانوی

اب اپنے آپ کو پہچاننے لگا ہوں میں
ایک آئینہ تھا جو بینائی دے گیا ہے مجھے

وہ اجنبی تھا مجاہد مگر جہاں بھی ملا
عجیب کیف شناسائی دے گیا مجھے

(۱۴) محسن مالیگانوی

فقیہہ شہر سیاست نے اک ہمارے سوا
ہر ایک شخص کو اہل کمال لکھا تھا

بھیڑ ہے آئینہ خانے میں بہت اندھوں کی
خود کو محسن یہاں پہچان تو ایسا ہے

لوٹ آنے میں ہمیں کتنے زمانے لگ گئے
جتنے بھی رشتے پرائے تھے ٹھکانے لگ گئے

گھر سے ہم نکلے تھے بھیگے کرب کی مٹی ہے
ہاتھ ہر موسم میں زخموں کے خزانے لگ گئے

(۱۵) صابر زاہد جلگانوی

ترازو ہوگیا ہے تیر دل میں
اگر دیکھو تو ہاتھوں میں کمان نہیں

ہماری ہڈیوں میں سرخ لاوا
جو بہہ جائے یہ وہ آتش فشاں نہیں

سخن اپنا ہے روح عصر زاہد
خدا رکھے، متاع رائیگاں نہیں

مقیم اثر بیاولی

مخالف تھے خداوندان خود سر
صفیں ان کی الٹ کر آ گیا میں

سمندر سے تو مرا کچھ نہ بگڑا
مگر قطرے سے دھوکہ کھا گیا میں

ترے الفاظ اب تک گونگے بہرے
بیاں سے اپنے پہنچا تا گیا میں

تبصرے

نقطۂ نظر

مُرتبہ
پروفیسر ظہیر علی

نام کتاب : سردار جعفری کی شاعری، فن یا مدفن ؟
مصنّف : ڈاکٹر داؤد کشمیری
طابع و ناشر : سید شاہد علی شہاب علی، بھاٹکلہ، ممبئی
صفحات : ۹۰ قیمت : ۵۰ روپے
تبصرہ نگار : پروفیسر ظہیر علی

عرصہ دراز کے بعد پھر ایک مرتبہ سردار جعفری کے نام کا شہرہ ہو رہا ہے۔ حال ہی میں انہیں ہندوستان کے اعلیٰ ترین ادبی انعام، گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا جس کے سبب ملک بھر میں تقریباً ہر زبان کے رسائل و اخبارات میں ان پر یا تو مضامین پھر نکل رہے ہیں یا ان کے انٹرویوز شائع ہو رہے ہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کا اعلان ہونے سے مہینہ دو مہینہ قبل ڈاکٹر داؤد کشمیری کی زیر تبصرہ کتاب منظر عام پر آئی تھی اور اس کے عنوان ہی نے اردو والوں کو چونکا دیا تھا۔ بہت جلد یہ کتاب اردو حلقوں میں بحث کا موضوع بن گئی۔ اب جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے کے بعد کتاب کی فروخت بھی بڑھ جائے گی۔

سردار جعفری ہمیشہ ہی ایک متنازعہ فیہ ادبی شخصیت رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد جدیدیت کے علم برداروں نے انہیں خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا۔ تاہم ڈاکٹر داؤد کشمیری کی تنقیدی یلغار جدیدیوں کی اندھی تقلید سے مختلف ہے۔ داؤد کشمیری نے سردار جعفری کے فن و شخصیت پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے اور اسی سبب انہوں نے اس کتاب میں سردار جعفری کی شاعری کے ہر پہلو پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ''پس معنی'' کے عنوان سے دو صفحات پر مشتمل پیش لفظ میں مصنف نے بجا طور پر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ کتاب ان کے تحقیقی مقالہ کی تلخیص نہیں بلکہ ''یہ تیس سال بعد ایک پختہ کاوش ہے۔ جس میں فکر و فیصلہ کی قطعیت ہے''۔

''پس معنی'' میں داؤد کشمیری نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے کہ جب انہوں نے تحقیقی مقالہ کا آغاز کیا تو سردار جعفری نے ''غیر ملکی شعراء کی ایک طویل فہرست لکھوا دی۔ سردار جعفری کے بقول ان شعرا کی اپروچ معلوم کرنے کے بعد ہی سردار جعفری کی شاعری کی صحیح پرکھ ممکن تھی۔'' سردار جعفری کے اس انوکھے بلکہ مضحکہ خیز اصرار کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی شاعری بذات خود اپنے مفاہیم اور محاسن کی ترسیل کرنے سے عاری ہے اور ان اوصاف کی تلاش کے لئے اسے غیر ملکی زبانوں کے شعراء کی اپروچ (؟) کی بیساکھیوں کا سہارا دینا ضروری ہے۔ بعض شعراء مشاعروں یا نجی نشستوں میں کلام سنانے سے قبل اپنی عجز بیانی کی پردہ پوشی کرنے کے لئے تمہید کے طور پر کوئی واقعہ یا کوئی دیو مالائی سمندر ہی تو بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد کوئی نظم یا غزل کا کوئی شعر سناتے ہیں۔ یعنی وہ نظم یا غزل کا وہ مخصوص شعر اپنے آپ ان مفاہیم کو ادا کرنے سے قاصر ہے جو شاعر کا مقصود ہے۔ اسی طرح اگر سردار جعفری کا یہ خیال ہے کہ ان کی شاعری کی صحیح پرکھ کے لئے قاری کو کئی غیر ملکی زبانوں کے شعراء کو پڑھنا ہوگا تو یہ ان کی اور ان کے کلام کے عجز بیانی ہوئی اس طرح کی لنگڑی لولی شاعری یقیناً غیر ملکی زبانوں کے شعراء کی بیساکھیوں پر چل سکتی ہے۔

دراصل نوآبادیاتی ذہن آج تک احساس کمتری سے نجات حاصل نہیں کر پایا ہے۔ مصر اردو زبان و ادب پر تو ہمیشہ زبانوں اور تہذیبوں کی اجارہ داری رہی ہے۔ پہلے فارسی زبان و ادب، اردو کے شعراء و ادباء کے لئے مثالی معیار تھا، برطانوی حکومت اور جدید تعلیم کے فروغ کے طفیل اب مغربی زبانوں کا ادب اور مغربی افکار ہمارے فنکاروں کے لئے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے قلم کار خصوصاً ناقدین اپنے مقالات کو در خورِ اعتنا بنانے کی خاطر مغربی مفکرین و ناقدین کے حوالے دینا لکھنے کے عمل کا ضروری جز خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خود ان کے خیالات و نظریات کسی مغربی دانشور کی پشت پناہی کے بغیر بے وقعت ہیں۔ یہ name - dropping کی بدعت اردو تنقید سے ہوتی ہوئی تخلیقی ادب میں در آئی ہے۔ سردار جعفری تو ویسے ہی شخصیت ساز انسان ہیں یعنی انہوں نے بڑی احتیاط سے خود اپنی شخصیت کو سنوارا اور نکھارا ہے اور اس کی تشہیر کی ہے۔ سامعین اور قارئین کو مرعوب کرنا سردار جعفری کا مرغوب مشغلہ ہے اور اس کا سب سے آسان گر یہ ہے کہ موقع محل دیکھ کر ایسے مفکرین یا دانشوروں کے حوالے دو جن کے بارے میں سامعین یا تمام قارئین بہت کم جانتے ہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے کے بعد جہاں کہیں بھی انگریزی اخبارات و رسائل میں ان کے بیانات یا انٹرویوز شائع ہوئے ہیں انہوں نے مغربی مفکر و شعراء کے نام نہیں گنوائے کیونکہ ان کے بارے میں تو انگریزی کا قاری سردار جعفری سے زیادہ جانتا ہے۔ ان کا مقصد تو انگریزی کے قاری کو مرعوب کرنا ہے اس لئے وہ اپنے انگریزی انٹرویو میں حافظ، کبیر، میرابائی اور غالب کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جب بھی اردو رسالے کے کسی رسالے یا میگزین میں ان کا کوئی انٹرویو شائع ہوتا ہے تو ہمیں کیٹس، بائرن، شیلے، برگساں، نطشے، ملٹن اور داوغیرہ کے ناموں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ یہی گر انہوں نے داؤد کشمیری پر آج سے تیس برس قبل آزمایا ہوگا، جب وہ ڈاکٹر نہیں بنے تھے بلکہ ادب کے صرف طالب علم تھے۔ اسی لئے انہوں نے سردار جعفری کے مضحکہ خیز اصرار کو بڑی معصومیت سے قبول کرتے ہوئے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے ساتھ ساتھ نفسیات اور جمالیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ چلئے اس طرح فائدے میں رہے کیونکہ اب ان کی ذات بقول ان کے "اردو اور انگریزی کے حسین سنگم کی۔۔۔ پہلی اور (غالباً تادم تحریر) آخری مثال ہے۔"

داؤد کشمیری کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ سردار جعفری بحیثیت نثار یا اشتراکی تھیوریسٹ منطقی شعور کے مالک ہیں اور اس لئے نثر کے میدان میں کامیاب ہیں۔ ان میں اس وجدان کی کمی ہے جو شعری شہ پاروں کی تخلیق کرتا ہے۔ اس لئے بحیثیت شاعر سردار جعفری ناکام ہیں۔ اس نظریے پر بحث کرتے ہوئے داؤد کشمیری نے کئی دلائل پیش کئے، مغربی افکار خصوصاً اشتراکیت اور ہیومنزم کا جائزہ پیش کیا، جعفری کی شاعری کے موضوعاتی اور اسلوبی پہلوؤں سے بحث کی، فیض، ساحر، اور مجاز کی شاعری سے جعفری کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے نظریے کو استدلالی انداز میں پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

نوے صفحات کی اس مختصر کتاب میں صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں رونما ہونے والے سماجی افکار کا جائزہ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر قدرے طویل ہو گیا ہے۔ اس کا جواز صرف اتنا ہے کہ سردار جعفری ان میں سے بعض افکار یعنی اشتراکیت اور ہیومنزم سے متاثر ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں چند باتیں خلاف امر واقعہ بیان ہوئی ہیں۔ داؤد کشمیری نے لکھا ہے کہ "ہیگل کے نزدیک سماج ریاست کی پیداوار تھا" (ص ۹)۔ یہ بات واقعاتی طور پر غلط ہے۔ ہیگل نے ریاست (state) کو خاندان (family) اور سماج (society) کے تصادم کی پیداوار کہا تھا۔ اس صفحہ پر داؤد لکھتے ہیں کہ "مارکس نے مذاہب کو (utopia) کہہ کر رد کر دیا"۔ یہ بھی غلط بیانی ہے۔ مارکس نے دراصل اپنے پیشرو اشتراکی مفکرین مثلاً سینٹ سائمن اور رابرٹ اوون کے نظریات کو (utopia) کہہ کر رد کیا تھا۔ مذاہب کے تعلق سے

مارکس کا مقولہ تو خاصا مشہور ہے کہ وہ انہیں (مذاہب) عوام کے حق میں افیون سمجھتا تھا۔ صفحہ ۱۱ پر ڈاکٹر داؤد کشمیری لکھتے ہیں "اینگلس نے

غم دوراں (Universal Suffrage) کو پرولتاری جدوجہد کے لئے مفید مانا ہے۔ " غم دوراں کا ترجمہ (Universal Sufferage یا Universal sufferage) کا ترجمہ غم دوراں بالکل غلط ہے۔ کیونکہ انگریزی میں (SUFFERAGE) کوئی لفظ نہیں ہے۔ اگر داؤد صاحب کی مراد معیبت یا الم سے ہے تو اس کے لئے انگریزی لفظ (Suffering) ہے۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے (SUFFRAGE) جس کے معنی حق رائے دہی ہے۔ اور اسی لفظ کے ساتھ اکثر (Universal) کا لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی تمام شہریوں کا حق رائے دہی۔ غم دوراں کے لئے (Universal suffrage) کی اصطلاح استعمال کرنا مہمل بات ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۶ پر داؤد نے ایک لفظ استعمال کیا ہے (Eqalitarianism)۔ انگریزی میں یہ لفظ بھی مفقود ہے۔ اگر داؤد کشمیری کا منشا نظریہ مساوات کے لئے انگریزی کا ہم معنی لفظ استعمال کرنا تھا تو وہ لفظ (Egalitarianism) ہے۔
بہر کیف کتاب کا یہ حصہ (ص ۸ سے ص ۱۹ تک) بہت کمزور بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ صرف سردار جعفری کا تعلق اشتراکیت یا اس کی بدترین شکل اسٹالن واد سے ظاہر کرنے کیلئے یوروپ کے سماجی افکار کی یہ لمبی چوڑی بحث بری طرح کھلتی ہے۔

سردار جعفری کے نظریات اور افکار سے بحث کرتے ہوئے داؤد نے صفحہ ۲۷ پر ایک عجیب مطالعہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں " سردار جعفری جب مارکس کی افادیت سے مایوس ہوئے تو مذہب کی طرف مراجعت کے بجائے ہیوم کے تئے فلسفہ میں پناہ لی۔ " گویا اسطرح جعفری نے غلطی کی اور انہیں مارکسزم سے مایوس ہونے کے بعد لازماً مذہب کی طرف مراجعت کرنی چاہئے تھی؟ یہ تو ذہن و دماغ پر آمریت چلانے والی بات ہوئی یعنی آپ فنکار کو یہ حق بھی دینا نہیں چاہتے کہ وہ اپنی مرضی و منشا کے نظریات اور افکار پر ایقان رکھے۔ داؤد صاحب ہیوم کے انسان دوستی کے نظریے کو مذہبی اقدار ہی کا دوسرا روپ کہتے ہیں۔ یہ رویہ حد درجہ تسہیلیت کی چغلی کھاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سردار جعفری نے کبھی یہ اعلان نہیں کیا کہ وہ مارکسزم سے مایوس ہوگئے یا وہ اشتراکیت کو غلط نظریہ سمجھتے ہیں انہوں نے صرف روس کی کمیونسٹ پارٹی کی کٹھ ملائیت کے خلاف بیان دیا جو حقائق پر مبنی ہے۔ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے یہ بیان سوویٹ یونین کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد دیا۔

سردار جعفری کے نظریاتی گراف کا مطالعہ کرتے ہوئے داؤد نے لکھا ہے کہ سردار جعفری نے "انسان دوستی" کے مسلک کو خیر آباد کہا اور دیش بھکت ہو گئے۔ چنانچہ پرولتاری آمریت کا نعرہ لگانے والا اب یہ کہنے لگا

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
(ص ۳۲)

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں لازماً یہ تاثر پیدا ہوگا کہ جب سردار جعفری پرولتاری آمریت سے کنارہ کش ہوئے تو اس کا اعلان مذکورہ بالا شعر کہہ کر کیا، جبکہ یہ شعر سردار جعفری کا نہیں جگر مرادآبادی کا ہے۔ اگر بات میں زور پیدا کرنے کے لئے جگر کا شعر استعمال کیا گیا ہے تو عبارت میں اس بات کا اظہار ضروری تھا کہ شعر جگر کا ہے۔ دوسرے اگر لفظ سیاست سے مراد پرولتاری آمریت لی جائے تو اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ شاعر نے پرولتاری آمریت کو خیر آباد کہا لیکن اس کے بعد دیش بھکتی کو گلے لگانے والی بات کا اظہار اس شعر کے

معروضیت سے نہیں ہوتا ہے۔

موضوعاتی پہلو پر بحث کرنے کے بعد داؤد کشمیری نے جہاں سردار جعفری کی شاعری کے فنی اور اسلوبی پہلوؤں سے بحث کی ہے تو وہ صحیح بات کو صحیح لہجہ میں کہنے "میں کامیاب رہے ہیں۔ داؤد نے بجا طور پر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ موضوعات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سردار جعفری کا ڈکشن بھی بدلتا رہا۔ شروعات میں جب وہ مارکسزم بلکہ اسٹالن واد کی قصیدہ گوئی کرنے کے تھے عام بول چال بلکہ گرے پڑے الفاظ میں شاعری کرتے تھے بعد میں فیض کی دیکھا دیکھی کلاسکی شعری ڈکشن استعمال کرنے لگے۔ ترقی پسند تحریک کے اولین دور میں سوائے فیض اور ساحر کے تمام شعراء نے نہ صرف کلاسکی شاعری کے روایتی موضوعات سے بغاوت کی تھی بلکہ کلاسکی شعری ڈکشن کو رد کر کے کرخت اور درشت الفاظ کو شعری زبان کا درجہ عطا کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کیونکہ گرے پڑے الفاظ کو فنکارانہ طور پر برت کر ان میں نئے مفاہیم اور تہ داری پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

یکساں موضوعات پر فیض، ساحر، مجاز اور سردار جعفری کی نظموں کا تقابلی مطالعہ بھی اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس حصہ میں داؤد کشمیری نے نہ صرف سردار جعفری کی فنی کمزوریوں کو اجاگر کیا بلکہ فیض، ساحر اور مجاز کے فنی محاسن پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ داؤد کشمیری نے سردار جعفری کو بحیثیت شاعر یک قلم رد نہیں کیا (کتاب کے عنوان سے اس طرح کی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے) بلکہ ان کے بعض نظموں کی تعریف بھی کی اور بجا طور پر کی۔ ترقی پسند شعراء میں سب سے زیادہ تجربے سردار جعفری نے کئے اور اس بات کا اعتراف داؤد نے بھی کیا کہ سردار جعفری کی آزاد نظمیں ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

سردار جعفری کے تعلق سے داؤد کشمیری نے ایک بڑے پتے کی بات کہی کہ انہوں نے صرف شاعری نہیں کی بلکہ اپنی شخصیت کو ہمہ جہت بنانے کی غرض سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو شاعری کے علاوہ افسانہ، تنقید، صحافت اور خطابت میں بھی صرف کیا اور داؤد کشمیری کے نزدیک یہی بات سردار جعفری کی بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صرف شاعری پر مرکوز نہیں کر سکے۔

داؤد کشمیری کی نثر بڑی رواں دواں ہے اور تنقیدی نثر کے مطالبات پوری کرتی ہے۔ وہ تنقیدی صلاحیت کے ساتھ ساتھ طنز کا استعمال بھی خوب جانتے ہیں۔ کتاب سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ کتاب کے اخیر میں داؤد کشمیری کی دوسری تنقیدی کتب کے زیر طبع ہونے کی اطلاع ہے۔ اگر یہ سب کتابیں منظر عام پر آجاتی ہیں تو سمجھئے کہ اردو کو ایک اور قابل قدر نقاد مل گیا۔

مت سہل ہمیں جانو....

کتاب کا نام : مت سہل ہمیں جانو...
مصنّف : انور ظہیر خان
قیمت : ۱۲۰ روپے
رابطہ : مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، علی گڑھ، ممبئی
تبصرہ نگار : ارتضیٰ نشاط

انجام کار انور ظہیر خاں نے اپنا راستہ منتخب کر ہی لیا۔ اب تک جس منزل کی تلاش میں وہ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے بالآخر انہیں مل ہی گئی۔ یہ تلاش و حصول جس قدر ان کے لئے باعث اطمینان ہے، ہمارے لئے بھی وجہ مسرت ہے کہ خاکہ نگاری کی تاریخی اور تہذیبی فہرست میں ایک توانا اور نئے نام کا اضافہ ہوا ہے "مت سہل ہمیں جانو" کی اشاعت پر انور ظہیر خاں کو مبارک باد نہ دینا اپنے آپ بے بہرہ ثابت ہونا ہے۔ انور ظہیر خاں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مضامین لکھنے سے کیا تھا۔ میر پر لکھے گئے ان کے اولین مضمون ہی نے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کی نشان دہی کر دی تھی۔

مضامین تبصرے، تقاریر، ادبی نشستوں کی نظامت اور خاکوں جیسی ڈھیر ساری مہمات سر کرنے کے بعد اپنے مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرنے کے بجائے خاکوں کے مجموعے کو ترتیب دینے کا خیال ذہن میں آنا آج ان کے لئے کیسا فال نیک ثابت ہوا ہے، اس کا اندازہ ان کے شناسا اور وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ان کے دلچسپ اور عجیب و غریب خاکوں سے لطف اندوز ہوں گے، ان خاکوں کو دلچسپ اور عجیب و غریب کہنے کی ایک خاص وجہ ان میں شخصیات کی حلیہ کشی ہے، راقم کے نزدیک مشکل اور پیچیدہ کو سہل اور خوشگوار بنانے کا عمل حلیہ کشی سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور آخر تک برقرار رہتا ہے یعنی یہ وہ شیرینی ہے جو ناگواری کے زیر اثر پیدا ہونے والی تلخی میں موقع بہ موقع شامل ہوتی رہتی ہے، شخصیت خاکہ نگار سے ناراض تو ہو سکتی ہے، متنفر ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔ حلیہ کشی ہی میں خاکہ نگاری کا اصل کمال مضمر ہے، پیش رو خاکہ نگاروں نے بھی حلیے کی دلچسپ کشیدہ کاریاں کی ہیں لیکن انور ظہیر خاں نے جس محنت اور کاوش اور اپنی تمام تر ذہانت کو بروئے کار لاکر جو حلیے تراشے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ڈاکٹر ظ انصاری کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔

"ان کا چہرہ کسی حد تک گول اور گال پچکے ہوئے سے تھے۔ آنکھیں روشن، جانے انجانے اندیشوں سے باخبر، ماتھے کی ریکھائیں گزرے سیلابوں کا پتا دیتی ہوئیں۔ کھچڑی بال آگے سے پیچھے کی طرف پلٹے ہوئے جن کی آدھی تعداد مہ و سال کی ہوا اڑا لے گئی تھی، گردن موٹی جو عموماً بالوں سے عاری رہتی، نتھنے پھولے ہوئے، ناک اونچی جیسے اونچی رکھنے کا سودا سر میں سمایا ہوا، رنگ سانولا سرخ، دہانہ قدرے بڑا، ہونٹ اوسطاً موٹے، دانتوں کی فصل کھڑی اور ہری بھری، خوب صورت ٹھڈی اور ٹھڈی میں گڑھا چہرہ کلین شیو، ناک پر چشمہ، چشمے کے پیچھے جگر جگر کرتی آنکھیں۔ جھانی کڑی کمان کی طرح تنی ہوئی جس کا تناؤ چھوٹی سی توند کی وجہ سے کم معلوم پڑتا"۔

اختر الایمان کے حلیے سے متعلق رقم طراز ہیں۔ "اختر الایمان کا قد سرو صنوبر تھا۔ جسم ساکھ کی لکڑی کی طرح مضبوط، رنگ دراوڑوں کا سا

بال بھینس کے کھی جیسے، سر پر بال اتنے ہی تھے جتنے کہ جسم پر ہر روئیں۔ کھلی کھلی پیشانی جس کے اطراف لٹیں جھومتی رہتیں۔ روشن آنکھیں کچھ ڈھونڈتی کچھ سوچتی سی۔ چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں رہتے، ہونٹ یوں لگتے جیسے ابھی ابھی جامنیں کھائی ہوں۔۔۔ اور یہ ہیں "احتجاج کی بے ہنگم آواز، بغاوت کا کاغذی پرچم، انقلاب کی۔ سنی جانے والی سرگوشی، مظلوم کا خاموش نعرہ اور علمیت کا مرعوب کن حوالہ" جناب باقر مہدی، کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔

"چوڑے چوڑے کندھوں پر، موٹی سی گردن، گردن پر گینڈے سا چہرہ اور بڑے گھیر کا کالر رکھا ہوا ہے، جس میں یک شیلف کے یک شیلف سما گئے ہیں۔ چند یا تارے کے تسلے سی چمکتی رہتی ہے۔ بالوں کی چھوٹی سی جھالر کنپٹی اور گدی کے اطراف لٹکتی رہتی ہے۔ ہونٹوں کا شمار بہت موٹوں میں ہے۔ بہت پتلوں میں۔ انجی سی ناک ایک سے ایک پڑھاکو کے سامنے انچی رہتی ہے۔ چشمے کے بھیتر سے جھانکتی آنکھیں تیر سی لگتی ہیں۔ ماتھا اور سر چٹیل میدان ہیں جنکی سرحد واحد کا پتا ہی نہیں چلتا۔ "ان خاکوں سے حاصل ہونے والی طمانیت اور مسرت خاکہ نگار اور قاری کا سب سے قیمتی نفع ہے۔ خاکوں کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو اپنے نفع سے باخبر رہنا ضروری ہے، ورنہ نقصان کے خاک میں مل جانے کا احتمال ہے۔

انور ظہیر خاں نے اپنے کرداروں کو نفسیاتی نقطہ نظر سے دیکھنے اور انہیں سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے اور جو باتیں محسوس کی ہیں وہ بے خوف و خطر بیان کر دی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ خبردار اگر آپ ادب اور زندگی میں توازن اور اعتدال برقرار نہیں رکھ سکتے تو کسی دن کوئی خاکہ نگار جو آج آپ سے بڑے ادب و احترام کے ساتھ ملاقاتیں کر رہا ہے وہ کل گھر کا بھیدی ثابت ہوگا اور آپ کا حلیہ بشرہ، احوال و معارف بھی اور مجلسی زندگی، عادات و اطوار اور فن و شخصیت سب کا پول کھول کر رکھ دے گا۔ لیکن خاکہ نگار کو یہ بات مدنظر رکھنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ وہ کہیں کسی کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے تو کام نہیں لے رہا ہے یا کسی کی تنقید کرتے وقت مبالغہ آمیز الفاظ تو استعمال نہیں کر رہا ہے، انور ظہیر خاں نے اس موقع پر بھی کمال احتیاط سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر انوکھے انکشافات ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک ڈھلتی شام ہے ڈاکٹر ظ انصاری اپنی خانقاہ انصاریہ میں (یونیورسٹی کلب ہاؤس کے دوسرے منزلے پر ظ انصاری کا کیمپ آفس)، بڑے سے ٹیبل سے لگی کرسی پر براجے ہیں، سامنے، پیچھے، نیچے، دائیں بائیں غرض ہر طرف کتابیں ہی کتابیں اور فائلیں ہیں۔ حاضری دینے ہمارے پیر بھائی ندیم صدیقی پیچھے ہیں اور پیر صاحب کے (ظ انصاری) حضور ایک چپ کچھ باادب عقیدت مند کی طرح ہاتھ باندھے بیٹھے یوں ہمہ تن گوش ہیں گویا عالم بے بدل اور صوفی باصفا سے سبزہ و گل، ستارے اور دریے، آب اور بادہ ناب، خدا اور انسان کی حقیقت کے رموز و اسرار کھلنا چاہتے ہوں یا کھل رہے ہوں۔ کرسی پر دونوں آسن جمائے ہوئے ہیں، پیری و مریدی کے مرحلے طے ہو رہے ہیں۔

یہ انکشاف دیکھئے "دروازے پر دستک دی تو گھنٹی لگی اور دودھ جیسے کرتے میں سمائے ہوئے اختر الایمان ہمارے سامنے تھے، ان کے دروازہ کھولتے ہی گھر میں پلے ہوئے کتے کی بو کا بھبکا نتھنوں میں بھر گیا، میں سوچنے لگا کہ انسان کے اپنے ارد گرد یا اندر کیسے کیسے جانوروں اور بدبوؤں کا وجود ہوتا ہے جن کے ہونے کا احساس اسلئے نہیں ہوتا کہ آدمی کی نیکیوں اور کارناموں کی خوشبو پھیلی ہوتی ہے یا احساس کے باوجود انسان نظر انداز کر جاتا ہے"۔

اور یہ بھی "باقر مہدی مٹی کے بدن کو مٹی کے حوالے کرنے کے بجائے اسے راکھ کر دینے کے قائل ہیں، انہیں انسان پیارا ہے اور انسانیت عزیز ہے مگر نسل انسانی کے ارتقاء پر پابندی لگانا ضروری سمجھتے ہیں، انہوں نے شادی بعد میں کی اور بچے پیدا نہ کرنے کا عہد پہلے کیا یہی وجہ ہے کہ گھر بچوں کی کلکاریوں سے محروم ہے۔ آدمی یار باش ہیں کل تک مجلسی تھے اب خلوتی ہو گئے ہیں، اگر انکی چیخیں، ہنسی، قہقہے گونجیں تو کمروں میں بال کھولے اداسی کے سونے کا گمان گزرے"۔ اور یہ انکشاف تو واقعی ماسٹر پیس ہے۔ عبارت کتنی چست اور

کراتی ہے " ندا فاضلی کے لائف اسٹائل کی بات چلی ہے تو یہ جتا دینا چاہیے کہ انہیں کسی کا سواگت کرنا ہے تو تالیاں، کسی کو داد دینی ہے یا بے داد کرنی ہے تو تالیاں، پروگرام کے آغاز پر تالیاں، اختتام پر تالیاں، بات بے بات پر تالیاں، ہاتھ پر تالیاں، تالیوں پر تالیاں۔ غرض ہنسی، ٹھٹھا، طنز، تلوار، تشکر سب کا مطلب تالیاں۔ ان کے لائف اسٹائل کو تالیوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔

"مت سہل ہمیں جانو---- "کا دیباچہ پڑھنا ناگزیر ہے، انور ظہیر خاں نے اپنے دیباچے میں نہ صرف خاکہ نگاری کے اصول و مبادیات سے بحث کی ہے بلکہ اس نئے دور میں عام ڈگر سے ہٹ کر کچھ نئی راہوں اور جہتوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس شخص نے بڑی محنت اور دلسوزی سے یہ کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے خاکہ نگاری پر ایک شاطر کی طرح خوب اچھی طرح غور کیا ہے اور بسم اللہ کہنے کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ہے۔

بازگشت

ادارہ

(قارئین کے خطوط)

جب سے آیا ہوں ایک ٹیلیفون کے سوا کوئی خط نہیں آیا۔ معلوم ہو سکا کہ سیمینار کب ہے۔ یہ پتہ چلا کہ نوائے ادب کے غالب نمبر کے نکالنے کا اب تک ارادہ ہے۔

انجمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کام کیسا چل رہا ہے۔ اگر حالات سازگار ہیں اور آپ کر سکتے ہیں تو ''بمبئی میں اردو'' نمبر شائع کریں۔ جس میں آزادی کے بعد بمبئی میں اردو کا جائزہ ہو۔ (۱) بمبئی میں اردو (۲) بمبئی میں اردو تعلیم (۳) بمبئی میں اردو شاعری (۴) بمبئی میں اردو نثر (۵) بمبئی کے شعراء (غزل گو، نظم گو، گیت کار وغیرہ) (۶) بمبئی کے نثر نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار وغیرہ (۷) بمبئی میں طنزیہ شاعری (۸) بمبئی میں طنزیہ نثر (۹) بمبئی کی اردو صحافت اور اخبارات (۱۰) بمبئی کے ادبی رسائل (۱۱) بمبئی کے اردو اسکول اور ادارے (۱۲) بمبئی کے ادیبوں کا اشاریہ یا ان کا الگ تعارف وغیرہ اگر آپ یہ نمبر شائع کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ تاریخی کام ہوگا اور آپ کو ہمیشہ اردو ادب کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ خدا کرے آپ ہر طرح بخیر ہوں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی (بھوپال)

- آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بے حد مسرت ہوئی۔ اس لئے بھی کہ میرا خط آپ تک پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے۔

جیسا کہ میں نے آپ کے ناندیڑ تشریف آوری کے دوران عرض کیا تھا کہ میرے پاس دو پروجیکٹ ہیں اور یہ پروجیکٹ ایسے ہیں کہ صرف انجمن اسلام جیسا ادارہ ہی ان کو نافذ کر سکتا ہے۔

۱ پہلا پروجیکٹ دارالترجمہ کا ہے، جو آپ کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے تحت قائم کیا جا سکتا ہے۔ اعظم گڈھ سے ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس میں عربی متن کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ ان اقتباسات کو یکجا کر کے مراٹھی میں کتابی شکل میں شائع کرنا ہے۔ اس موضوع پر میرا ایک مختصر مضمون ''عربی گرنتھات بھارت درشن'' مراٹھی مقامی روزنامہ میں شائع ہو چکا ہے اس کی زیراکس ان شاء اللہ آئندہ بھیج رہا ہوں۔

۲ — اورنگ زیب میموریل انسٹی ٹیوٹ کا قیام اورنگ آباد میں ضروری ہے۔ کیونکہ قریب ہی خلد آباد میں عالمگیر کا مدفن ہے۔ ایک بڑی درگاہ کے احاطہ میں ہے۔ کئی سال پہلے میں نے اورنگ آباد کے معززین کے سامنے یہ پروجیکٹ رکھا تھا لیکن کسی نے توجہ نہیں دی۔

ان پروجیکٹس کے لئے مالی امداد بھی سرکار کی جانب سے مل سکتی ہے۔ آپ چونکہ راجدھانی میں رہتے ہیں اس لیے اس تعلق سے آسانی کوشش کر سکتے ہیں۔

۳۔۔۔ مصروفیات کی وجہ سے زیادہ مضامین نہیں لکھ پاتا۔ کئی سال پہلے یہ مضمون اردو اکیڈمی کے امکان میں شائع ہوا تھا۔ شاید یہ ۸۰ کی دہائی کا وقت ہوگا۔ انشاءاللہ آئندہ ''عرب۔۔۔ہندوستان تعلقات'' پر لکھوں گا۔

پروفیسر ہم کے شاذلی۔۔۔ ناندیڑ

- ''ششماہی نوائے ادب'' کا مزید ایک شمارہ موصول ہوا۔ آپ کی ڈائرکٹر کے عہدہ پر تقرری پر جلگاؤں میں مبارکباد پیش کرچکا تھا، تحریری طور پر بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ نہ صرف تحقیقی ادارہ بلکہ ''نوائے ادب'' بھی ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔ ''نوائے ادب'' اگر سہ ماہی کر دیا جائے تو آپ کا یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ ششماہی مدت طویل لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی نگرانی میں ''انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' میں موجود رسائل کے ذخیرہ کا اشاریہ شائع ہو تو ریسرچ کا کام کرنے والوں کو سہولت ہوگی۔

آپ کی زیر ادارت ''نوائے ادب'' ترتیب کے مرحلے سے گذر رہا ہوگا، ممکن ہے کہ طباعت کی نوبت آگئی ہو ایک اور تحقیقی مقالہ۔۔۔ ''خاندیش میں اردو شاعری کی روایت'' ارسال خدمت ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے اور ''نوائے وقت'' کی اشاعت میں شائع کر کے ممنون کریں گے۔

ڈاکٹر اکبر رحمانی (جلگاؤں)

مقالہ نما

مرتبین

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی
ڈاکٹر خورشید نعمانی
پروفیسر انور ظہیر خان

شخصیات

★ بدر مسعود ماہنامہ شب خون الہ آباد — بابتہ اپریل ۱۹۹۷ ص ۳-۴
"محمود ایاز کی یاد میں" مشہور شاعر، ادیب اور صحافی مدیر سوغات (بنگلور) محمود ایاز کی وفات پر تاثراتی مضمون ہے۔

★ ساجد رشید "گوشۂ ارتضیٰ نشاط" نیا ورق۔ ممبئی جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۷
اس گوشے میں ارتضیٰ نشاط کی شخصیت پر دو خاکے (پروفیسر یداللہ مہدی اور انور ظہیر خاں) اور ان کی شاعری پر دو مضامین (عبدالاحد ساز اور انور خان) شامل ہیں۔

★ سید خالد قادری ماہنامہ سب رس، حیدرآباد (اے پی) بابتہ جولائی اگست ستمبر ۱۹۹۷ ص ۴۷—۵۳
"شاذ تمکنت یادوں کے آئینے میں" اردو کے جواں مرگ شاعر حضرت شاذ تمکنت کے بارے میں تاثراتی مضمون ہے۔

★ میر ہاشم ماہنامہ سب رس حیدرآباد (اے پی) بابتہ جولائی اگست ستمبر ۱۹۹۷ ص ۳۶—۳۹
"تمہارا نام محبت، خلوص، درد، وفا" شاعر و صحافی سلیمان اریب مرحوم کی زندگی اور شاعری کا تجزیہ ہے۔

★ اقبال متین ماہنامہ سب رس، حیدرآباد (اے پی) بابتہ جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۱۲—۳۳
"باتیں ہماریاں" مصنف کے خود نوشتہ حالات کی پہلی قسط

★ صغریٰ مہدی "ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۴۲—۴۳
"جو بادہ کش تھے پرانے" جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے سابق استاد سید مجتبیٰ حسین زیدی مرحوم کے انتقال پر تعزیتی نوٹ

★ عبداللطیف اعظمی ماہنامہ کتاب نما۔ دہلی بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۶۹-۷۱
"سید مجتبیٰ حسین زیدی مرحوم" جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک مخلص استاد اور کارکن کی رحلت پر تاثراتی مضمون

★ فضل حسنین ماہنامہ کتاب نما۔ نئی دہلی بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۵۱—۵۵
"اپنی کلاہ کج ہے" موجودہ عہد کے نامور نقاد و شاعر پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کے بارے میں تاثراتی مضمون۔

★ مجتبیٰ حسین: ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی۔ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۴۷—۵۰
"حجاب قزلباش کا ماضی" پاکستان کی مشہور شاعرہ محترمہ حجاب قزلباش کی زندگی کا دلچسپ خاکہ ہے۔

★زبیر رضوی ماہنامہ کتاب نما۔ نئی دہلی بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ء ص ۲۹—۳۱
''میں دلیپ سنگھ کو نہیں جانتا'' اردو اور انگریزی کے صاحب طرز مزاح نگار آنجہانی دلیپ سنگھ پر تاثراتی مضمون ہے۔
★ڈاکٹر تو قیر احمد خان۔ ماہنامہ کتاب نما۔ نئی دہلی بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ء ص ۱۷—۲۸
''پروفیسر امیر عارفی سے ایک ملاقات'' اردو کے مشہور شاعر، ادیب و محقق اور دہلی یونیورسٹی کے موجودہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر امیر عارفی سے لیا گیا ایک معلومات افروز انٹرویو ہے۔
★مرتبہ ایاز محمود ایاز نمبر اور گوشۂ شفیق الرحمٰن سوغات (بنگلور، نومبر ۱۹۹۷ء)
اس میں محمود ایاز کی شخصیت، مدیرانہ صلاحیت، شاعرانہ جوہر اور تنقیدی بصارت و بصیرت کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ اور گوشۂ شفیق الرحمٰن کی ذات اور فنی کائنات کا محاکمہ موجود ہے۔
★حافظ سید عرفان علی (علیگ) ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، بابتہ نومبر ۱۹۹۷ء ص ۴۳—۵۴
''مولانا محمد علی جوہر'' رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی زندگی ان کے جذبۂ آزادی اور ان کے مذہبی معتقدات کا ذکر کیا گیا ہے۔
★پروفیسر نور الحسن نقوی: ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۳۹—۴۲
''بابائے اردو مولوی عبدالحق'' بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی سیرت و کردار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی چھتیسویں برسی پر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔
★حسن منظر ماہنامہ شب خون الہ آباد۔ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۵—۱۰
''عجب آزاد مرد تھا'' اختر الایمان کی زندگی اور شاعری کا معروضی جائزہ۔
★شکیل الرحمٰن۔ ہماری زبان۔ نئی دہلی، ۲۲ جنوری ۱۹۹۸ء جلد ۵۷ شمارہ ۴
شکیل الرحمان نے ''مانی'' آرٹ اور اس کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے غالب کی جمالیات میں مانی کی جمالیات کا عکس دیکھنے کی کوشش کی ہے۔
★محمود ایوبی: نیا ورق ممبئی اکتوبر تا مارچ ۱۹۷۸ء
''بہت یاد آتے ہیں شہزاد منظر'' اس میں محمود ایوبی نے شہزاد منظر کی شخصیت اور کمانے دھمانے کے لئے جدوجہد کا بھرپور خاکہ پیش کیا ہے۔

ادبیات

★پروفیسر منیجر پانڈے: ماہنامہ سب رس، حیدرآباد (اے پی) بابتہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۲۰—۳۹
''ادب کی سماجیات اور مارکسیت'' ایک فکر انگیز موضوع جسے ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے ہیں دیو نش۔
★ڈاکٹر ضیاء الدین: ماہنامہ سب رس، حیدرآباد (اے پی) بابتہ جولائی اگست ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۲۷—۳۳
''کرشن چندر کی افسانہ نگاری'' کرشن چندر کے فن افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ ہے۔

★ پروفیسر تقی علی مرزا ماہنامہ سب رس، حیدر آباد (اے پی) بابت جولائی، اگست ستمبر ۱۹۹۷ ص ۲۲—۲۵
''ہائیکو'' جاپانی ادب کی صنف شاعری ''ہائیکو'' کی ہیئت اور اس کے حسن کو مثالوں کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔
★ ڈاکٹر معین الدین عقیل: ماہنامہ سب رس، حیدر آباد (اے پی) بابت جولائی اگست ستمبر ۱۹۹۷ ص ۵۴—۶۴
''مکاتیب آباد'' ''محمد مہدی واصف مدراسی کے نایاب رقعات کے مجموعے ''مکاتیب آباد'' کا اردو میں تعارف ہے۔
★ ممتاز مفتی ماہنامہ تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ بابت ستمبر ۱۹۹۷ ص: ۵۳—۶۳
''لبیک'' اردو کے ممتاز فکشن نگار ممتاز مفتی کے دلچسپ سفر نامۂ حج کی گیارہویں قسط۔
★ حکیم محمد حسین خاں شفا رامپوری ماہنامہ کتاب نما۔ نئی دہلی بابت اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۳—۶
''آزادی کے پچاس سال اور اردو'' ''کتاب نما کے مہمان مدیر کی حیثیت سے اداریہ کی شکل میں ایک سرسری جائزہ لیا ہے۔
★ احمد محفوظ ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی بابت اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۱۱—۱۶
''کلام میر میں عام انسانی صورتحال'' ''میر تقی میر کے کلام کی روشنی میں مذکورہ بالا موضوع پر مدلل بحث کی ہے۔
★ خامہ بگوش ماہنامہ کتاب نما۔ نئی دہلی، بابت اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۳۳—۳۸
''مانگے کا اجالا'' احمد بشیر، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔
★ قیوم خضر ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی بابت اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۳۹—۴۳
''مکاں'' ''میں فکر و خیال کے ۳۲ دروازے'' ''مشہور ادیب پیغام آفاقی کے ناول ''مکاں'' کا فنی تجزیہ کیا ہے۔
★ ڈاکٹر میر جہاں ماہ نامہ کتاب نما نئی دہلی بابت، اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۶۶—۶۸
''فیض اور ان کی نظم تنہائی'' ''فیض احمد فیض کی نظم کا ناقدانہ تجزیہ ہے۔
★ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی ماہ نامہ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۶۰—۶۴
''سرسید اور اردو زبان و ادب'' ''سرسید نے براہ راست اور بالواسطہ اردو زبان، اس کی نثر و نظم سبھی کی توسیع اور دور رس خدمت انجام دی ہیں۔
★ سرور عالم ندوی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۷۳-۸۱
''سرسید کے شعری بصیرت اور ذوق سخن'' ''سرسید احمد خاں محض ایک ماہر تعلیم، مصلح قوم اور ادیب و شاعر و صحافی۔ تھے بلکہ ان میں شعری بصیرت اور ذوق سخن بھی بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔
★ سید حامد ماہ نامہ، تہذیب الاخلاق۔ بابت نومبر ۱۹۹۷ ص ۳-۵
''استفادہ'' ''مشورہ دیا ہے کہ اردو، ہندوستان کی علاقائی زبانوں سے بھرپور استفادہ کرے۔ یہ استفادہ زبان و بیان، لفظ و اسلوب تک محدود نہ رہے بلکہ مضمون۔ معنی، مفہوم کو بھی اس داد و ستد کی پکڑ میں آنا چاہئے۔
★ رضا الجبار ماہ نامہ، کتاب نما، نئی دہلی، بابت جنوری ۱۹۹۸ ص ۳—۱۴
''کینیڈا میں اردو'' ''کتاب نما کے مہمان مدیر کی حیثیت سے رضا الجبار صاحب نے معلومات افروز اعداد و شمار فراہم کئے ہیں۔
★ پروفیسر گوپی چند نارنگ ماہ نامہ کتاب نما۔ نئی دہلی، بابت جنوری ۱۹۹۸ ص ۱۷—۵۴

''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت'' مذکورہ بالا موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

★ خامہ بگوش: ماہ نامہ کتاب نما، نئی دہلی، بابتہ جنوری ۱۹۹۸

''مانگے کا اجالا'' پاکستانی شاعر احمد بشیر اور کشور ناہید کے بارے میں فکاہیہ مضمون

★ وزیر آغا: ماہ نامہ شب خون۔ الہ آباد، بابتہ فروری ۱۹۹۷ ص: ۵۵۔۵۷

''علامت کیا ہے'' ادب میں علامت نگاری کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔

★ حامد کاشمیری ماہ نامہ شب خون الہ آباد بابتہ اپریل ۱۹۹۷ ص ۵ — ۸

''ساقی فاروقی کی نظم 'نوحہ'۔ مذکورہ نظم کا مختصر تنقیدی مطالعہ ہے۔

★ شمس الرحمان فاروقی: ماہ نامہ شب خون الہ آباد۔ بابتہ اپریل ۱۹۹۷ ص ۱۹ — ۲۰

''دست خود دہان خود'' خود اپنی ذات کے حوالے سے شاعر و ادیب کے تخلیقی سفر کی مختلف کیفیات کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔

★ شمس الرحمان فاروقی: ماہ نامہ شب خون الہ آباد۔ بابتہ اپریل ۱۹۹۷ ص ۲۱ — ۲۲

''میں کون ہوں اے ہم نفساں'' دوسرے ناقدین ادب کی آرا پیش کرتے ہوئے مصنف نے خود اپنے تخلیقی عمل پر شذرات لکھے ہیں۔

★ عذرا عباس: ماہ نامہ شب خون الہ آباد۔ بابتہ اپریل ۱۹۹۷ ص ۴۵

''میں لائینیں کیوں کھینچتی ہوں'' مصنفہ نے خود اپنی شاعری کا محاسبہ کیا ہے۔

★ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ۔ ماہ نامہ شب خون، الہ آباد، بابتہ اپریل ۱۹۹۷ ص ۵۱ — ۵۹

''ایلیٹ کا اردو دنیا میں خیر مقدم'' انگریزی کے مشہور ناقد اور ڈرامہ نگار ٹی ایس ایلیٹ کے بارے میں ایک اہم مضمون

★ شمس الرحمٰن فاروقی ماہ نامہ شب خون، بابتہ جولائی ۱۹۹۷ ص ۹ — ۲۰

''ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات'' اردو کلاسیکی غزل کے بارے میں کچھ تاریخی اور تنقیدی باتیں

★ مہدی جعفر ماہ نامہ شب خون الہ آباد، بابتہ اگست ۱۹۹۷ ص ۲۵ — ۲۸

''مابعد جدیدیت کا قصہ'' تحریک جدیدیت کی ایک اہم کڑی مابعد جدیدیت پر مدلل گفتگو کی ہے۔

★ شمس الرحمٰن فاروقی۔ ماہ نامہ شب خون، بابتہ اگست ۱۹۹۷ ص ۳ — ۶

''میر اردو اور میں'' سرسوتی سمان پانے پر فاروقی صاحب کا خطبہ

★ انیس اشفاق ماہ نامہ شب خون، بابتہ اگست ۱۹۹۷ ص۔ ۵۳ — ۷۲

''غزل کا نیا علامتی نظام'' غزل کے موضوع پر جدید شاعر ظفر اقبال کے حوالہ سے تفصیلی بحث کی ہے۔

★ جیلانی کامران: ماہ نامہ شب خون، الہ آباد، بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۷ — ۱۱

''تنقید سے توقعات میں تبدیلی'' جدید تنقید شعر و ادب کے تناظر میں نئے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔

★ شمس الرحمٰن فاروقی: ماہ نامہ شب خون، الہ آباد، بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۲۳ — ۲۶

''ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو'' اردو کے تعلق سے اٹھنے والے چند نئے سوالات اور ان کی وضاحت

★ ڈاکٹر ماجد دانی: ہماری زبان، نئی دہلی ۱۵ستمبر ۱۹۹۷ جلد ۵۶ شمارہ نمبر ۳۵ ص ۲ اور ۷

''اردو صحافت اور دشواریاں'' اردو صحافت کے اہم معاملات اور مسائل کا ہمہ جہتی جائزہ لیا گیا ہے۔

★ ظہور الاسلام: ہماری زبان نئی دہلی ۱۵ستمبر جلد ۵۶ شمارہ ۳۳ ص ۱ اور ۳

''اردو ہے جس کا نام۔۔۔'' مختلف ادوار میں اردو کے مختلف ناموں، اسی کے لوحہ لوحہ ارتقا اور موافقانہ اور حریفانہ رویوں کا ذکر

★ مرزا خلیل احمد بیگ ماہ نامہ شب خون، الہ آباد، ماتہ دسمبر ۱۹۹۷ ص ۳۷۔۔۔۴۵

''مغرب کے چند اسلوبیاتی نظریہ ساز'' علم لسانیات کے ایک اہم شعبہ ''اسلوبیات'' کا سائنٹفک مطالعہ ہے۔

★ شمس الرحمان فاروقی ماہ نامہ شب خون الہ آباد، ماتہ دسمبر ۱۹۹۷ ص ۱۱۔۔۔۱۳

''ریڈکلف، ماؤنٹ بیٹن اور آڈن کی نظم'' انگریزی زبان کے تین شاعروں کی نظموں کا تعارف

★ عتیق حنفی: جامعہ، نئی دہلی اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۷ جلد ۹۴، شمارہ ۱۰۔۔۔۱۲

''غزل اس نے چھیڑ دی'' غزل کو ادبی زاویے سے زیادہ تہذیبی اور تمدنی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کامیاب کوشش

★ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ہندوستانی زبان۔ ممبئی اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۷ شمارہ ۴

''حافظ اور کبیر۔ ایک عہد دو آوازیں'' بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ اس مقالہ میں حافظ اور کبیر کی حیات اور کارناموں میں اشتراک اور افتراق کے پہلو تلاش کئے گئے ہیں

★ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی جامعہ، نئی دہلی اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۷ جلد ۹۴ شمارہ ۱۰۔۔۔۱۲

''کلام فراق میں زمانی تلازمات'' اس مقالے میں فراق کے تصور وقت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام میں زمانی تلازموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

★ محمد حسن عسکری / ترجمہ سہیل احمد فاروقی جامعہ، نئی دہلی اکتوبر دسمبر ۱۹۹۷ جلد ۹۴ شمارہ ۱۰۔۔۔۱۲

''بیسویں صدی کا مزاج'' بیسویں صدی میں ہونے والی فکری تبدیلیوں اور ان کے ادب پر اثرات کا جائزہ

★ شہباز حسین ہماری زبان، نئی دہلی ۸ دسمبر ۱۹۹۷ جلد ۵۶ شمارہ ۴۶

''اردو آزادی سے پہلے۔ آزادی کے بعد'' اس مضمون میں شہباز حسین نے آزادی سے قبل اور مابعد اردو کی سمت و رفتار اور ترقی و مزاحمتوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

★ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ہماری زبان، نئی دہلی ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ جلد ۵۶ شمارہ ۴۷

''ہماری زبان'' اس میں مضمون نگار نے اردو کی پیدائش اور پھر اس کے نشو و نما میں کن لوگوں نے حصہ لیا۔ اس کا جائزہ پیش کیا ہے۔

★ منظور عثمانی: ہماری زبان نئی دہلی یکم دسمبر ۱۹۹۷ جلد ۵۶ شمارہ ۴۵ ص ۶ اور ۸

''پچاس سال کی اردو دشمنی'' اس میں انہوں نے گذشتہ پچاس برسوں میں ہندوستان میں اردو پر کی جانے والی مراعات اور اس کے ساتھ ہی زیادتیوں کا ذکر کیا ہے۔

★ اکبر حیدری کشمیری ہماری زبان، نئی دہلی ۸ جنوری ۱۹۹۸ جلد ۵۷ شمارہ ۲

''آتش لکھنوی۔ تحقیق کے آئینے میں'' اس میں آتش لکھنوی کے کچھ نئے گوشے تلاش کئے گئے ہیں۔

★ڈاکٹر صاحب علی: ہندوستانی زبان۔ ممبئی جنوری مارچ ۱۹۹۸ء شمارہ ۱

''جنگ آزادی اور اردو صحافت'' اس مضمون میں اردو صحافت کا جامع انداز میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی جنگ آزادی میں اردو صحافت کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

★انتظار حسین: ماہ نامہ شب خون الہ آباد بابتہ جنوری ۱۹۹۸ ص ۲۵—۲۸

''دیار ہند میں اردو'' سفر ہند کے دوران لکھا ہوا دلچسپ رپورتاژ ہے۔

★آصف فرخی، ماہ نامہ شب خون، الہ آباد بابتہ اکتوبر نومبر ۱۹۹۷ ص ۳۳—۴۹

''فراق اور جلاوطنی کے افسانے'' پاکستان کے نئے افسانہ نگار عامر حسین سے ایک ادبی مذاکرہ

★شمس الرحمٰن فاروقی، مریم کمار نظر: ماہ نامہ شب خون۔ الہ آباد، بابتہ اکتوبر، نومبر ۱۹۹۷ ص ۷—۱۷

''نقاد اور شاعر کے مابین مکالمہ'' چودھری ابن النصیر نے اس مکالمے کو انگریزی سے اردو میں ڈھالا ہے۔

★علی سردار جعفری: ماہ نامہ شب خون الہ آباد، بابتہ جنوری ۱۹۹۸ ص ۹—۱۹

''سرمایۂ سخن'' اردو کی ادبی تاریخ کے پس منظر میں زبان و بیان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے

★شمس الرحمٰن فاروقی: ماہ نامہ شب خون، الہ آباد، بابتہ فروری ۱۹۹۸ ص ۵—۳۷

''نقد معائب'' مولانا حسرت موہانی کے طویل مقالہ ''معائب سخن'' کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

متفرقات

★شمس الرحمان فاروقی: ماہ نامہ شب خون الہ آباد۔ شمارہ فروری ۱۹۹۷ ص۔ ۳۹—۴۱

''قوم، ریاست اور معاصر اردو ادب'' احمد محفوظ صاحب نے فاروقی صاحب کے اس انگریزی مقالہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو کرناٹک ساہتیہ اکیڈمی کے سیمینار میں ۱۹۸۷ میں پڑھا گیا تھا۔

★اختر حسن: ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد (اے پی) بابتہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۷ ص ۳—۱۱

''یادوں کی سیرگاہ'' حیدرآباد (اے پی) کے بارے میں مسلسل رپورتاژ کی چوتھی قسط ہے

★ڈاکٹر راہی فدائی: ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد (اے پی) بابتہ جولائی اگست ستمبر ۱۹۹۷ ص ۳۳—۶۷

سلطنت خداداد کا غدار اور اس کا قاتل'' میسور کے نواب ٹیپو سلطان شہید کا غدار اور وطن دشمن میر صادق کون تھا اس کی موت کیسے ہوئی تھی اور کب؟

★ڈاکٹر سید مشرف علی: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۳۸—۴۲

''علم و ثقافت کا ایک اہم مرکز: میر اکادمی'' آل انڈیا اکادمی دہلی کی شاخ لکھنؤ کی کارگزاریوں اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔

★محمد اسحٰق: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۲۶—۲۷

''غریب ذہین طلباء کا تعلیمی مستقبل'' کئی زندہ مثالوں کے حوالے سے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر غریب مگر ذہین طلباء کی بروقت اور مناسب مالی امداد اور حوصلہ افزائی کی جائے تو ملت کا بے حد فائدہ ہو سکتا ہے۔

★ شریف احمد خاں: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۲۰ — ۳۴

''معاشی ناہمواریوں کا ہولناک انجام'' مختلف حوالوں کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ معاشرے کے افراد کی ایک بہت بڑی اکثریت بنیادی انسانی حقوق سے کیوں محروم ہے؟

★ سید حامد (سابق وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ) تہذیب الاخلاق ستمبر صفحہ ۳ — ۷

''احتساب'' آزادی ہند کے بعد مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور مادی پسماندگی کے اسباب و علل کا پتہ لگایا ہے۔

★ ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۸ — ۱۹

''تعلیم — معیار اور اقدار'' والدین اساتذہ اور طلباء کے باہمی تعاون سے موجودہ معیار تعلیم کو بلند کرنے کی ترغیب دی ہے۔

★ ڈاکٹر محمد خالد محمود ماہ نامہ کتاب نما، نئی دہلی بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۶۳ — ۶۵

''صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں'' جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں شعبۂ اردو کی استاد محترمہ صغریٰ مہدی کی وظیفہ یابی پر تاثراتی مضمون

★ ڈاکٹر ابو وارث جمیل ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۸۲ — ۸۴

''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طبی خدمات'' اجمل خاں طبیہ کالج۔ دواخانہ طبیہ کالج وغیرہ کی تاسیس اور ان کے مقاصد کا خلاصہ پیش کیا ہے

★ مظفر حسین غزالی. ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۷۶ — ۸۱

''پاپا میاں (شیخ عبداللہ) اور تعلیم نسواں'' سر سید احمد خان مرحوم کے ساتھی شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں کی خدمات کا تفصیلی تعارف ہے۔

★ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی. ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۵ — ۱۱

''سر سید کا ایک عظیم کارنامہ'' سر سید کی قائم کردہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تفصیلی تعارف ہے۔

★ پروفیسر اصغر عباس ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۱۲ — ۱۵

''سر سید صدی کے کام'' ۱۹۹۸ میں منائی جانے والی صدی کے پروگراموں کے سلسلے میں کچھ تجویزیں

★ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۱۹ — ۲۹

''سر سید کا تہذیبی شعور'' سر سید کی زندگی اور ان کے تعمیری پروگراموں کے پس منظر میں یہ ثابت کیا ہے کہ سر سید کی ہمہ گیر، علمی اور سماجی خدمات کے پیچھے سب سے زیادہ طاقتور محرک ان کا تہذیبی شعور ہی تھا۔

★ کے۔ ایم آصف اعظمی فلاحی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۵۲ — ۵۹

''سر سید کا نظریہ قومیت'' سر سید کا نظریہ قومیت، دو قومی نظریہ ہرگز نہ تھا ان کا خیال تھا کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے کیوں نہ ہوں۔

★ ڈاکٹر سید مشرف علی: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ ص ۶۳ — ۶۶

''سر سید۔ ایک سوشل ریفارمر'' مسلمانوں کی سماجی اصلاح کے سلسلہ میں یہ سر سید کی علمی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

★ محمد ریاض الدین احمد ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ نومبر ۱۹۹۷ء ص ۶ — ۸
"کیا ماحولی تبدیلیاں عالمی سونامی کا نشان ہیں؟" ماحولی تبدیلیوں کی عالمی سونامیوں سے بچنے کے لئے کچھ عملی مشورے دیئے ہیں۔ مضمون انگریزی سے ترجمہ ہے۔
★ پروفیسر نسیم احمد نذیری ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ نومبر ۱۹۹۷ء ص ۱۲ — ۱۷
"مسلمانوں میں تعلیمی برتری کی ضرورت" مسلمانوں کو پس ماندگی کی حالت سے نکالنے کے لئے اسکولی سطح کی تعلیم کے دوران بچوں کے اندر لیاقت اور قابلیت کی فصل کاری، وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ مضمون کی پہلی قسط ہے۔
★ محمد ذکریا ورک ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ نومبر ۱۹۹۷ء نومبر ۱۹۹۷ء ص ۴۲ — ۴۴
"گیلی لیو — عدالت میں" اپنے سائنسی نظریات کی بنا پر مشہور سائنس داں گیلی لیو گیلی لائی کو جن قانونی کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کا تفصیلی بیان ہے۔
★ ممتاز مفتی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ نومبر ۱۹۹۷ء ص ۵۸ — ۶۳
"لبیک" سفر نامۂ حج کی دلچسپ بارھویں قسط
★ پروفیسر نسیم احمد زیدی ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۳۳ — ۴۰
"عمدہ تعلیمی استعداد کے عوامل" ایک مقامی ریسرچ پروجکٹ کے تحت مسلمانوں کے عمدہ تعلیمی استعداد کے عوامل کا پتہ لگایا ہے۔
★ ممتاز مفتی: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ۵۷ — ۶۳
"لبیک" دلچسپ سفر نامۂ حج کی تیرہویں قسط
★ فیاض حمید ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۵۱ — ۵۳
"وٹامن 'اے'" وٹامن 'اے' کی حقیقت اور اس کے فوائد کا ذکر کیا ہے مضمون پر ہلاد کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔
★ ڈاکٹر قمر الدین ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۴۱ — ۴۲
تعلیم اور سائنسی طرز فکر "انسان کی شخصیت میں سائنٹفک طرز فکر کا ارتقا انسان کی شخصیت کے مجموعی ارتقا ہی کا ایک حصہ ہے۔
★ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۳۷ — ۴۰
"سرسید کی انقلاب آفریں جدوجہد" ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی بیداری یقیناً سرسید اور ان کی تحریک کی مرہون منت ہے۔
★ سید حامد ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۲۵ — ۲۸
"منفی عافیتیں" مسلمانوں کو ہمدردانہ مشورہ دیا ہے کہ وہ بنیادی امور پر متحد ہو جائیں، جہالت کو دور کریں، صحت و صفائی کی طرف دھیان دیں، محض منہ چھپانے اور منفی عافیتوں کے سہارے زندہ رہنا مشکل ہے۔
★ محمد ذکریا ورک ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۳ — ۲۴
"قوموں کے عروج و زوال میں سائنس اور ٹکنالوجی کا کردار" ادارۂ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ منعقد مضمون نویسی کے مقابلے میں اول انعام حاصل کرنے والا مضمون

★ ممتاز مفتی: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ جنوری ۱۹۹۸ ص ۵۸—۶۳
"لبیک" دلچسپ سفرنامہ حج کی چودھویں قسط

★ حکیم محمد مسیح الدین صدیقی: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ جنوری ۱۹۹۸ء ص ۴۲—۵۰
"سلامتی۔ فطری قوانین کے تحفظ میں" آج انسانوں کی بھلائی اور سلامتی و خیر اسی میں ہے کہ وہ قدرتی قوانین کا تحفظ اور فطری اصولوں کی نگہداشت کریں۔

کے۔ ایم۔ آصف اعظمی فلاحی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ جنوری ۱۹۹۸ء ص ۳۸—۴۱
"اعلیٰ ہندوستانی قدار اور الکٹرونک میڈیا" ہندوستان کے پچاس سالہ جشن آزادی کے سلسلہ میں ایک فکر انگیز اصلاحی مضمون

★ پروفیسر نسیم احمد زیدی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ جنوری ۱۹۹۸ء ص ۲۷—۳۷
"مسلمانوں میں تعلیمی بدحالی کی وجہ" مضمون کی تیسری قسط ہے۔

★ محمد ریاض الدین ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ جنوری ۱۹۹۸ ص ۲۴—۴۱
"دو ڈور۔ زمانہ چال قیامت کی چل گیا" ہندوستان اور امریکا کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی حالات کا تقابل کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو زیادہ تیز رفتاری کی دعوت ہے۔

★ ڈاکٹر حبیب الحق انصاری ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ جنوری ۱۹۹۸ ص ۱۸—۲۳
"قوموں کے عروج و زوال میں سائنس اور ٹکنالوجی کا کردار" رسالہ تہذیب الاخلاق" کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مقابلہ مضمون نویسی کا مضمون جس پر دوسرا انعام دیا گیا۔

★ پروفیسر محمد شریف خاں۔ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ جنوری ۱۹۹۸ ص ۴—۶
"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ" وقت آگیا ہے کہ ہم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ذریعہ تعلیم اردو کو رائج کریں۔

اسلامیات

★ این۔ میری شمل ماہ نامہ شب خون۔ الہ آباد۔ بابتہ جولائی ۱۹۹۷ ص۔ ۴۳—۴۸
"اسلامی تہذیب۔ شعر و ادب اور آج کی دنیا" مہر افشاں فاروقی کا ترجمہ کردہ مضمون

★ اختر حسین فیضی۔ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۱۱—۱۵
"مدارس اسلامیہ کے تعلیمی مسائل اور ان کا حل" مدارس اسلامیہ کے تعلیمی و تربیتی پس ماندگی۔ نصاب تعلیم، تاریخ و تنقید ادب عربی، ادب کے معنی و مفہوم۔ ادب و سیاست اور حدیث پاک کی فصاحت و بلاغت پر ایک پر مغز تقریر کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

★ پروفیسر بدرالدین الحافظ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ ص ۱۶—۱۹
"فاروق اعظم کی سماجی فکر" خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے مثالی اسلامی مساوات، غربا پروری، اور عوام کی خوشحالی کے سلسلے میں جو پند و نصائح کئے اور عملی طور پر جو قابل تقلید سبق دیئے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

★ عتیق جیلانی سالک: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۲۳—۲۵
''ملاعبد العلی بحر العلوم اور رام پور'' علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے ایک فرد، مدرسۂ عالیہ رام پور کے مدرس اعلیٰ اور مدرسۂ اعظم مدراس کے بانی ملاعبد العلی (بحر العلوم) کا تفصیلی تعارف ہے۔

★ سطوت ریحانہ: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۲۸—۳۴
''مصر میں نسائی تحریک اور قاسم امین'' مصر میں حقوق نسواں اور ان کی آزادی کی تحریک کے سرگرم کارکن قاسم امین کی خدمات کا ذکر ہے۔

★ عثمان انفضال احمد: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۳۵—۳۷
''قومیت، بین الاقومیت اور اسلام'' قومیت اور بین الاقوامیت کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔

★ ڈاکٹر شاہد قمر قاضی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۴۷—۴۹
''تصوف کیا ہے؟'' تصوف کی ماہیت و حقیقت اور اس کی روحانی فضیلت پر تبصرہ کیا ہے۔

★ ڈاکٹر قیصر حبیب ہاشمی: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۵۰—۵۲
''نشہ، انسانیت کا خطرناک دشمن'' قرآن و حدیث کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ نشہ حرام ہے۔

★ فاروقی نثار احمد، ہماری زبان نئی دہلی یکم اکتوبر ۱۹۹۷ء جلد ۵۶، شمارہ ۳۷، ص ۵ اور ۸
''کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند'' پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مذکورہ کتب خانے میں مختلف علمی اور مذہبی موضوع پر نادر و نایاب مخطوطوں اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔

★ ضیاء الدین اصلاحی۔ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۹۷ء جلد ۱۶۰ شمارہ ۵
''سیرۃ النبی جلد پنجم کے بعض قرآنی مباحث'' اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر باب کے شروع میں کوئی قرآنی آیت درج ہے پھر اس آیت کی روشنی میں موضوع سے بحث کی ہے گویا ساری بحث اس آیت یا آیات کی بلامبالغہ دل نشیں تفسیر معلوم ہوتی ہے (جاری)

★ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی۔ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ء ص ۳۰—۴۰
''سرسید اور دینی مدارس کی اصلاح'' سرسید احمد خاں دینی مدارس کی ہر سطح پر مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی متناسب آمیزش اور قدیم نصاب تعلیم میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔

★ ڈاکٹر توقیر عالم ندوی۔ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ء ص ۴۱—۵۱
''سرسید کے مذہبی افکار و نظریات'' سرسید نے مذہب کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور اسی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ ان کی عقیدہ تھا کہ اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا مسلمانوں کے لئے اصلی قومی بہبودی ہے۔

★ احتشام الحق قاسمی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۹۷ء ص ۶۷—۷۲
''خواتین اسلام اور سرسید کے نظریات'' سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان خواتین شرعی حدود میں رہتے ہوئے مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ شاہراہ زندگی پر گامزن ہوں۔

نوائے ادب، ممبئی

FORM : IV - ROLL NO : VIII

Registration No. 32009/50 | رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ ممبئی (۱)
نوعیت اشاعت	:	ششماہی
نام پرنٹر	:	جناب عبدالمجید پاٹکا ، بی کام (آنرز)
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ ممبئی (۱)
نام پبلشر قومیت پتہ	}	ایضاً
نام ایڈیٹر	:	ڈاکٹر آدم شیخ ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ ممبئی (۱)
نام پتہ مالک رسالہ	:	ایضاً

میں عبدالمجید پاٹکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پاٹکا

نوائے ادب

ششماہی

مدیر

ڈاکٹر آدم شیخ

●

جلد ۴۸ شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۹۸ء

مندرجات

۱	باتیں ہماریاں	مدیر	۲
۲	سفر جاری ہے (ہماری کوششیں)	ادارہ	۳
۳	دارالمصنفین۔ مولانا شبلی کی تصنیفی تحریک	ڈاکٹر خورشید نعمانی	۵
۴	مراٹھی نثر کا ارتقاء (۱۵ویں صدی کے نصف دوم سے)	ڈاکٹر یونس اگاسکر	۱۵
۵	ایران کا نظامِ جمال اور فنونِ لطیفہ	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	۲۶
۶	اردو ادب میں سیکولر مشترکہ تہذیب (آزادی کے پچاس سالہ)	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۳۴
۷	تماشائی	ڈاکٹر آدم شیخ	۴۱
۸	نقطۂ نظر (تبصرے)	مرتبہ:- پروفیسر ظہیر علی مبصرین:- ڈاکٹر صاحب علی ڈاکٹر زبیدہ جمانی ، نجمہ شیخ	۴۲
۹	بازگشت (قارئین کے خطوط)	ادارہ	۶۷
۱۰	مقالہ نما	مرتبین: ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی ڈاکٹر خورشید نعمانی پروفیسر انور ظہیر خاں، نجمہ شیخ	۶۹

●

اپریل ۱۹۹۹ء سے نوائے ادب کی اشاعت سہ ماہی ہوگی اور رسالہ اپریل، جولائی، اکتوبر اور جنوری میں شائع ہوا کرے گا۔

سالانہ قیمت اندرون ملک ۱۰۰؍ روپے - بیرون ملک ۱۰؍ ڈالر

اداریہ

باتیں ہماریاں

یہ امر ہمارے لئے باعث مسرت ہے کہ نوائے ادب کا اپریل تا ستمبر ۱۹۹۸ء کا شمارہ علمی، ادبی و تحقیقی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ اس شمارے کے تعلق سے ادارے کو جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان میں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے علمائے ادب اور قارئین کرام نے کئی مفید مشورے بھیجے ہیں۔ بعض حضرات نے مواد اور پیشکش کے تعلق سے ہماری کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ان تمام مشوروں اور تجاویز کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ نوائے ادب کا کس باریک بینی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ موجودہ شمارے کے مضامین اور طباعت میں ادارے نے ان تمام مشوروں کو مد نظر رکھا ہے۔

نوائے ادب کے سرپرستوں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آئندہ مالی سال سے رسالے کی اشاعت سہ ماہی کر دی گئی ہے۔ اب نوائے ادب ہر سال اپریل، جولائی، اکتوبر اور جنوری میں شائع ہوا کرے گا۔ رسالے کی سالانہ قیمت سو روپے ہوگی۔ امید ہے کہ انجمن اسلام، ممبئی کی اس اردو نوازی کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو داں حلقوں میں یہ سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ امسال اکتوبر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد نے ملک کے کئی شہروں میں پہلی بار اہلیتی امتحان کے مراکز قائم کئے۔ اس امتحان میں ہزاروں امیدواروں نے شرکت کی۔ انجمن اسلام نے بھی ممبئی میں امتحانی مرکز کا اہتمام کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام اور اولین امتحان کا انعقاد، اردو والوں کے لئے خوش آئند حقیقت ہے۔ امید ہے کہ یہ اردو یونیورسٹی ملک میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

نوائے ادب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ترجمان ہے اور ادارے کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر اس میں تنقیدی و تحقیقی مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ناقدین و محققین حضرات سے گذارش ہے کہ وہ ہمیں اپنی تخلیقات سے نوازیں۔ حسب معمول ہمیں آپ کے مشوروں اور تاثرات کا انتظار رہے گا۔

آدم شیخ

سفر جاری ہے.....

انجمن اسلام، ممبئی

(۱) ۳؍جولائی ۱۹۹۸ء۔ انجمن اسلام ہائی اسکول (وی ٹی) کے سابق پرنسپل اور ادارۂ انجمن اسلام کے فعال اور ممتاز رکن جناب خلیفہ ضیاء الدین کی رحلت پر انجمن اسلام کمپلیکس (وی ٹی) میں تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ مرحوم خلیفہ ضیاء الدین صاحب کے مداحوں، دوستوں اور شاگردوں کے ایک کثیر مجمع سے جناب عبدالرحمٰن انتولے (سابق وزیر اعلیٰ مہاراشٹر اور صدر انجمن اسلام) اور جناب ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا صاحب (صدر انجمن اسلام) نے خطاب کیا۔ دونوں حضرات نے مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر مفصل روشنی ڈالی۔ اسی جلسے میں ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے یہ اعلان کیا کہ ماہم، ممبئی کے انجمن اسلام گرلس اسکول کو مرحوم خلیفہ ضیاء الدین صاحب کے نام سے منسوب کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ مرحوم کے نام سے اسکالرشپس بھی جاری کئے جائیں گے۔

(۲) ۴؍جولائی ۱۹۹۸ء ۔ ورسوا، ممبئی کے انجمن اسلام کمپلیکس میں واقع اردو ہائی اسکول ، انگریزی ہائی اسکول اور پرائمری اسکول کو بیگم جمیلہ حاجی عبدالحق کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کے علاوہ انجمن اسلام بیگم جمیلہ حاجی عبدالحق کالج آف ہوم سائنس فور ویمن، ورسوا، کا افتتاح عالی جناب عبدالرحمٰن انتولے صاحب، سابق صدر انجمن اسلام اور وزیر اعلیٰ مہاراشٹر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا صاحب نے فرمائی۔

(۳) ۹؍جولائی ۱۹۹۸ء۔ انجمن اسلام نے ایران کلچر ہاؤس ممبئی کے تعاون سے عید میلاد النبی کے موقع پر ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ اس جلسے میں ممتاز عالم دین مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا ریاض احمد اور جناب بشارت شکوہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایران کلچر ہاؤس ممبئی کے ڈائرکٹر جناب فرہاد پالیز دار نے بھی سامعین کو مخاطب کیا۔ صدر انجمن اسلام ڈاکٹر جمخانہ والا نے صدارت فرمائی۔ سامعین سے خطاب کرتے ہوئے، تمام مقررین نے، مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان وحدت و یگانگت پر زور دیا۔ اردو کے مشہور شاعر جناب گنیش بہاری طرز نے اپنا نعتیہ کلام سنایا۔

(۴) ۱۵؍اگست ۱۹۹۸ء۔ انجمن اسلام کے تمام اداروں کی شرکت سے وی ٹی کمپلیس میں جشن آزادی برپا کیا گیا۔ صدر انجمن ڈاکٹر جمخانہ والا نے پرچم کشائی کی۔ مختلف اسکولوں اور اداروں کے طلباء و طالبات نے مارچ پاسٹ میں حصہ لیا۔ آخر میں مختلف اداروں کے سربراہوں اور صدر انجمن کے درمیان ایک مذاکرہ ہوا اور اداروں کے معیار کو بہتر بنانے کی مختلف تدابیر پر غور و خوض کیا گیا۔

(۵) ۲۸ر ستمبر ۱۹۹۸ء۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے وائس چانسلر عالی جناب شمیم جیراج پوری صاحب کے لئے اکبر پیر بھائی ہال میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی۔ اس استقبالیے میں انجمن اسلام کی جنرل کاؤنسل کے ممبران اور شہر کی ممتاز سماجی اور علمی شخصیتوں نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر جھگانہ والا صاحب نے انجام دیے۔

(۶) ۶راکتوبر ۱۹۹۸ء ۔ انجمن اسلام ممبئی نے ممبئی گاندھی اسمارک ندھی، منی بھون گاندھی سنگھر الیہ اور بھارتیہ ودیا بھون کے اشتراک سے بھارتیہ ودیا بھون ہال میں، اردو، ہندی، مراٹھی مشاعرے کا انعقاد کیا۔ ڈاکٹر جھگانہ والا صاحب نے اس ادبی و تہذیبی تقریب کی صدارت فرمائی۔

(۷) یکم نومبر ۱۹۹۸ء۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد، کے پہلے اہلیتی امتحان کے لئے انجمن اسلام (وی ٹی) کمپلیکس کو مرکز بنایا گیا۔ اس امتحان کا اہتمام انجمن اسلام کی جانب سے اطمینان بخش طور پر کیا گیا۔ ماہنامہ شگوفہ حیدر آباد کے مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے تشریف لائے اور اردو کے تعلق سے انجمن کی اس خدمت کو سراہا۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(۱) ۹۹۔۱۹۹۸ء کے تعلیمی سال سے جنوبی ممبئی کے مختلف کالجوں میں زیر تعلیم طلباء وطالبات کے لئے اردو مضمون کی خصوصی کلاسوں کا اہتمام کیا گیا۔

(۲) ۸راگست ۱۹۹۸ء۔ یونائیٹڈ وے چیریٹیبل ٹرسٹ کی جانب سے انجمن اسلام گرلس ہائی اسکول اور جونیئر کالج باندرہ میں ایس ایس سی امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے والے طلباء کو انعامات تقسیم کئے گئے۔ اس تقریب میں درس و تدریس کو اور مفید اور موثر بنانے کی تجاویز پر غور وخوض ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر آدم شیخ نے اس مباحثے میں حصہ لیا۔

(۳) ۸ اور ۹ر ستمبر ۱۹۹۸ء۔ مہاراشٹر اسٹیٹ بیورو آف ٹیکسٹ بک حکومت مہاراشٹر کی اردو اور عربی لینگویج کمیٹیوں کی میٹنگ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی۔ مذکورہ دونوں کمیٹیوں نے انسٹی ٹیوٹ کی لائبریریوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

(۴) ۹راکتوبر ۱۹۹۸ء۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر آدم شیخ نے نقش کوکن ٹیلنٹ فورم کے بیسٹ اسٹوڈنٹ اور بیسٹ ٹیچر ایوارڈ طے کرنے والے پینل میں بحیثیت جج شرکت کی۔

(۵) مہاراشٹر اسٹیٹ بیورو آف ٹیکسٹ بک نے ڈاکٹر آدم شیخ کو نصابی کتابوں کی تحقیق سے متعلق ورک شاپ میں مدعو کیا۔ بیورو نے مالیگاؤں کے شاہد اختر صاحب اور بھیونڈی کے اصغر حسین قریشی صاحب کے تحقیقی مقالوں کے لئے ڈاکٹر آدم شیخ کو نگراں مقرر کیا۔

دارالمصنفین...... مولانا شبلی کی تصنیفی تحریک

ڈاکٹر خورشید مظہر الحق نعمانی
(سابق استاد۔ شعبہ اردو ، مہارشی دیانند کالج ۔ ممبئی)

(قسط دوم)

مولانا شبلی اور دارالمصنفین کا تخیل! ہر قوم کی تاریخ میں کچھ افراد ملتے ہیں جو ہر قسم کی مالی منفعت سے بے نیاز ہو کر قوم کی فلاح و بہبودی اور علمی وادبی خدمت کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیتے ہیں اور اپنے افکار اور کاوشوں سے قوم کے دل ودماغ میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں، علی گڑھ تحریک نے ایسے سرفروشوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی تھی لیکن اس جماعت کا کام انفرادی شخصیتوں تک محدود تھا، ہر چند، حالی شبلی اور ذکاء اللہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے لیکن شبلی کا ذہن ان بزرگوں سے مختلف تھا وہ مخلص کام کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنے مذہب، اپنی ملت، اپنے تمدن، اپنی تاریخ، اپنی زبان وادب کی خاموش خدمت انجام دے سکے بالآخر یہ جماعت دارالمصنفین کی شکل میں منصۂ شہود پر آئی۔

مولانا شبلی کو اس بات کا احساس شدت سے تھا کہ آج کا مسلمان اپنے مذہب اور اس کی قیمتی میراث سے بیگانۂ محض ہے۔ جدید تعلیم نے اس کی آنکھوں پر مغربیت کی عینک چڑھا دی ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس کے سامنے مذہب کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ اپنی اس متاع عزیز کی قدر و قیمت سمجھ سکے۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کثیر رقم درکار تھی لیکن شبلی تو ایک گدائے بے نوا تھے ان کی ساری کائنات ان کے چند تلامذہ اور احباب خاص تھے اور انہیں سے ان کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔

مولانا شبلی نے ان لوگوں کے سامنے تصنیف و تالیف کا ایک مخصوص لائحہ عمل پیش کیا جس کے مختلف عنوانات قائم کئے گئے۔ مثلاً فلسفہ جدید کو ملکی زبان میں منتقل کرنا، فلسفہ جدید کے مسائل پر جدید علم کلام کے رنگ میں روشنی ڈالنا، اسلامی تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب اور علوم جدیدہ کی اسی رنگ کی تالیفات کو سامنے رکھ کر دونوں کا موازنہ کرنا اور پھر اسلامی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے انہیں عنوانات پر جدید تالیفات تیار کرنا، مخصوص علوم دینیہ، تفسیر، حدیث، اصولِ فقہ، تصوف اور کلام کو نئے رنگ میں پیش کرنا، پھر ان علوم اسلامیہ کی تدریجی ترقیوں پر تبصرہ، ان کے غلط و صحیح حصول پر تنقید و اصلاح، فارسی، عربی وارد و ادبیات کی تاریخ، اسلامی تہذیب و تمدن پر مؤرخانہ تنقید اور پھر تہذیب اسلامی اور تمدن جدید کے تعلقات کی تشریح، یہ وہ خاکہ تھا جسے مولانا شبلی نے علوم اسلامیہ کی نئی تالیفات کے لئے مرتب کیا تھا۔ اب ذرا ان اغراض و مقاصد کو مولانا شبلی کی تحریر ہی میں قلمبند کیا جائے۔

(۱) فلسفہ حال کے اصول اور ان کا معتد بہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے۔

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفۂ حال کے وہ کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں، پھر ان مسائل کو یارد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آج کل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن میں اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں ان میں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں۔ان ہی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، موازنہ کر کے بتانا چاہئے کہ دونوں کی مختلف خصوصیات کیا ہیں، اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح ہے۔

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زمانے میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتیں گئیں اور کن اسباب سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے، کس قدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے۔

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشاء پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جارہے ہیں، اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے سے لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخانہ مضامین لکھیں جائیں۔ مثلاً انتظامِ عدالت، انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مؤرخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا کیا اضافہ ہوا۔"[۱]

ابتدائی خیال : مولانا شبلی کے ذہن میں دارالمصنفین کی تجویز کتب خانہ ندوۃالعلماء کی عمارت کے سلسلہ میں سب سے پہلی بار آئی، مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں دارالعلوم کی دوسہ سالہ رپورٹ انہوں نے لکھ کر پیش کی تھی اس میں یہ بھی لکھا تھا -

> "قومی اور مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے اسی قدر ایک قومی کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے، تو ضرور ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر، بیش بہا تصانیف موجود ہوں جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہو، تاکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں"

یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہو، جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دیا جائے" سید سلیمان

---

[۱] افادات مہدی صفحہ ۲۷۳ ۲۷۴

ندوی لکھتے ہیں کہ اس جلسہ میں پڑھنے کے لئے "ندوہ میں ایک عظیم الشان ! کتب خانہ کی ضرورت۔" کا عنوان مولانا نے میرے سپرد کیا تھا اور ارشاد ہوا کہ اس سلسلے میں ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کروں۔ سید صاحب نے جو تجویز پیش کی وہ مولانا شبلی کی اس تجویز کا اعادہ تھی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اگست ۱۹۱۰ء میں نواب مزمل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا کو لکھا کہ وہ ان کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوائیں گے تو مولانا نے الندوہ میں یہ نوٹ لکھا۔

"جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دارالعلوم کے بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں، ہماری تصنیفات کی تو خیر کیا وقعت ہے لیکن نواب صاحب موصوف چونکہ علم دوست ہیں اس لئے انہوں نے علم پروری کا یہ بھی ایک بہانہ پیدا کرلیا ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارلعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو، جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شائع ہوں، باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آکر رہیں، ان کے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم و فنون کی کتابیں مہیا رہیں۔ چونکہ ندوہ کا کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طلباء میں تصنیف و تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس لئے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح موزوں ہے۔ نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں، اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لئے دس ہزار روپیہ درکار ہوگے۔" ؀۲

یہ تمام منصوبے ابھی عملی شکل اختیار نہ کرسکے تھے کہ ندوہ میں اختلاف کا دور شروع ہوگیا اور مولانا شبلی نے جولائی ۱۹۱۳ء میں وہاں کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا لیکن اب اس خیال نے اور زور پکڑا چنانچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین زبیری (جو اس وقت ہزہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے) کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں -

"ہاں، یہ دونوں (سلیمان، عبدالسلام) اچھے بن گئے۔ کمبخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈالا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ بہر حال یہ طے ہوئے کہ کہاں صدر مقام کروں، انشاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التصانیف بن جائے۔ ہندوستان میں اور کام کے نئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا کام ہے۔ ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔" ؀۳

دارالمصنفین کی تجویز کی اشاعت:- اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب شبلی سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف میں ہمہ تن مصروف تھے، سیرت اکیڈمی اور دارالمصنفین کی تاسیس کا خیال بار بار ان کے ذہن میں آتا تھا اور وہ اپنے احباب اور شاگردوں سے مشورے کرتے تھے۔ بالآخر انہوں نے ۱۱؍ فروری ۱۹۱۴ء کے "الہلال" میں یہ اہم تجویز شائع کی اور انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ شائع کیا:

"خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ہوتے

۱۔ بحوالہ سہ سالہ رپورٹ ندوۃ العلماء از شبلی نعمانی، مطابق مارچ ۱۹۱۱ء

۲ الندوہ اگست ۱۹۱۰ء از مولانا شبلی نعمانی بحوالہ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ص ۶۹۲

۳۔ مکاتیب شبلی حصہ اول از شبلی نعمانی مکتوب بنام منشی محمد امین زبیری مکتوب نمبر ۱۸ ص ۲۴۸

جاتے ہیں لیکن بایں ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاء پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ ان کی مستقل تصانیف نہیں ہیں بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں ۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کی تصنیف کے لئے جو سامان درکار ہے، وہ مہیا نہیں ہے۔ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں جو انتخاب، استنباط و اقتباس کے کام آئے۔ اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دل جمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں۔ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور تبادلہ خیالات ہو سکے۔ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ایک وسیع دار التصنیف اصول ذیل کے موافق قائم کیا جائے۔

۱)ایک عمدہ عمارت "دار التصنیف" کے نام سے قائم کی جائے جس میں ایک وسیع ہال کتب خانے کے لئے ہو اور جس کے حوالی میں ان لوگوں کے قیام کے لئے کمرے ہوں جو یہاں رہ کر کتب خانے سے فائدہ اٹھانا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں۔

۲)یہ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں اور ان مشہور مصنفین کے نام سے موسوم ہوں جو تصنیف کی کسی خاص شاخ کے موجد اور بانی فن ہوں۔

۳)ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کیا جائے جس میں کثرت تعداد ہی پر نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب، ہو نادر اور کامیاب ہو۔

۴) تصنیفی وظائف قائم کئے جائیں اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے۔ یہ وظائف ماہوار ہوں گے یا کسی تصنیف و تالیف کے صلے کے طور پر دیئے جائیں گے۔"(وغیرہ وغیرہ) ؎۱

اس تجویز کی اشاعت کے بعد زیر تجویز ادارہ کے اہتمام و انصرام کا کام مولوی مسعود علی ندوی کو جن کی انتظامی قابلیت اور حسن تدبیر کے مولانا معترف تھے، سپرد کرنا چاہا، اسی بنا پر دار المصنفین کے آئندہ قیام و نظام کے مشورے اس زمانے میں ان سے ہوتے رہے جن کے اذکار ان کے خطوط میں بکثرت ہیں۔

دار المصنفین کا مرکز:- مولانا کی دلی خواہش یہ تھی کہ دار المصنفین ندوہ ہی میں قائم ہو چنانچہ مولوی مسعود علی نے جب ان کو یہ لکھا کہ دار المصنفین لکھنؤ میں اور ندوہ ہی کے احاطہ میں قائم ہو تو اس کے جواب میں انہوں نے ۷ ؍۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا -

"بھائی وہ لوگ دار المصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں۔ میری اصل خواہش یہی ہے لیکن کیا کیا جائے حالانکہ اس میں انہیں کا فائدہ ہے۔" ؎۲

دار المصنفین کے قیام کے سلسلے میں مولانا نے مولانا حبیب الرحمن شیروانی کی رائے مانگی، مولانا شیروانی نے ان کے لئے

؎۱ الہلال ۱۱/ فروری ۱۹۱۱ء

۲ مکاتیب شبلی حصہ دوم مکتوب ۱۳ بنام مولوی مسعود علی ندوی ص ۱۲۷

خود اپنے وطن حبیب گنج کی پیش کش کی جسے مولانا نے منظور نہیں کیا اور انہیں لکھا کہ:-

"آپ دار المصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں۔ اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں۔" [1]

بالآخر دار المصنفین کے مرکز کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ قاضی تقدیر نے کر دیا یعنی اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم کی موت نے ان کو اعظم گڑھ آنے پر مجبور کیا۔ یہاں سکون و اطمینان نظر آیا تو اس شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی ندوی کو لکھا:-

میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔"

میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیم کے کام شروع ہو گئے ہیں۔ کسی طور سے کوئی رکاوٹ نہیں ۔ بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے، باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں سگان بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا، دار المصنفین بھی شروع ہو جائے گا۔" [2]

مولانا شبلی منزل میں بیٹھ کر اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل میں لگ گئے۔ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر کی فکر، شبلی اسکول کی دھن، دار المصنفین کا قیام اور سیرۃ نبوی ﷺ کی تکمیل، مولانا کے یک سر و ہزار سودا کے مصداق تھی۔ یہ تفصیل ان کے مکتوب بنام مولانا شیروانی مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء سے ظاہر ہوتی ہے۔-

"مجھ کو اس کام کے علاوہ دار المصنفین اور دار التکمیل کی فکر ہے۔ ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا۔ چھ برس تک کشاکش میں گذرے۔ جو کچھ ہو گیا وہ تعجب انگیز ہے۔ بہر حال صورت موجودہ یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ گیارہ بیگھہ پختہ ہے اس کو وقف کر رہا ہوں اور شرکاء بھی راضی ہو گئے ہیں۔ مسودہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ رجسٹری کراتا ہے۔ دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتدبہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا بلکہ صرف کتب خانہ کے لئے کافی ہو گا۔ درا لمصنفین کی اجازت سے کچھ اضافہ ہو گا۔ چاہتا ہوں اس کے لئے چار کمرے چار عناصر اربعہ کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں۔ چندہ مشروط نہیں۔ ہر صاحب قلم چندہ بھی نہیں دے سکتا۔ اس کے ساتھ دار التکمیل بھی کھول رہا ہوں یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے لئے طلبہ کو تیار کروں، دو مددگار ہوں گے، انتہائی مفون کو خود پڑھاؤں گا۔ سر دست طلباء تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہو گا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرۂ معلومات اور کتابیں ان کو دی جائیں گی۔ جو کچھ لکھیں گے ان کا عیب و ہنر ان کو بتایا جائے گا، پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصانیف کرائی جائیں گی۔ وظائف

---

[1] ۳۔مکاتیب شبلی جلد دوم مکتوب بنام حبیب الرحمن شیروانی مکتوب ۱۱۵ ص ۲۰۹

[2] مکاتیب شبلی حصہ دوم مکتوب ۲۷ بنام مولوی مسعود لی ندوی ص ۱۳۸

تصنیفی مقرر ہوں گے جو کم از کم ۲۰۔ ۲۵ روپے ماہوار ہوں گے۔ دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی، کانٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے۔ یہ آخر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ

" چوں ہنرہائے دگر موجب حرماں نشود "

نواب عماد الملک نے دارالمصنفین کی صدر انجمنی قبول کرلی ہے، تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے"۔ ۱

ان مراحل کے طے ہو جانے کے بعد مولانا نے چند قواعد مرتب کئے اور اپنے تلامذۂ خاص کو خطوط بھیجے کہ وہ رخت سفر باندھنے کے لئے تیار ہو جائیں لیکن ابھی یہ سروسامان ہو ہی رہے تھے کہ خود قافلہ سالار نے ہی ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیا سے رخت سفر باندھ لیا اور دارالمصنفین کی تجویز عملی شکل اختیار نہ کرسکی لیکن مولانا کی یہ پیشن گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

"میں اس عمارت کو انشاءاللہ تعالیٰ پورا کر کے رہوں گا اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو"۔ ۲

مولانا کے انتقال کے وقت دارالمصنفین جس شکل میں موجودہ تھا وہ دو کچے بنگلے، چند سو کتابوں اور چند الماریوں پر مشتمل تھا اور یہی اس خواب کی حسین تعبیر تھی جسے مولانا نے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ مولانا چونکہ دارالمصنفین کو بالکل ندوہ کے نہج پر چلانا چاہتے تھے اس لئے اس میں دو شاخیں درجہ تکمیل اور درجۂ تفسیر قائم کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے جانشینوں اور شاگردوں نے اس کو صرف تصنیف و تالیف ہی تک محدود رکھا اس لئے اول الذکر سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

دارالمصنفین کا قیام :- مولانا شبلی کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کے قیام کی باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۱۴ء کو یعنی مولانا کی وفات کے تیسرے دن مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کی دعوت پر ان کے تلامذہ اور احباب جمع ہوئے اور ایک عارضی مجلس "اخوان الصفاء" کے نام سے قائم کی گئی جس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی، ناظم مولانا سید سلیمان ندوی اور مہتمم مولانا مسعود علی ندوی منتخب ہوئے۔ اس مجلس کا سب سے پہلا کام سیرۃ نبوی ﷺ کی تکمیل قرار پایا۔ نواب سلطان جہاں بیگم، فرمانروائے بھوپال مرحومہ کی خدمت میں اس مقصد کے پیش نظر مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی حاضر ہوئے اور انہوں نے بدستور سیرۃ نبوی کا ماہانہ وظیفہ جو مولانا شبلی کو ملا کرتا تھا جاری رکھا۔ مولانا کے باغ اور بنگلے کا وقف جو نا تمام رہ گیا تھا اس کے لئے ۲۴ر نومبر ۱۹۱۴ء کو عمائدین شہر کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور وقف کے بقیہ مراحل طے کئے گئے اور مولانا کے احباب خاص میں مرزا محمد سلیم مرحوم و مرزا محمد نعیم مرحوم کا باغ بھی جو مولانا کے باغ سے ملحق تھا دارالمصنفین پر وقف کیا گیا۔

دارالمصنفین کے لئے کوئی سرمایہ نہ تھا نہ اس کی کوئی باضابطہ جماعت تھی اور نہ اس کے مقاصد اور دستور العمل کا خاکہ ہی تیار ہوا تھا اس لئے دارالمصنفین کے مقاصد و قواعد کا خاکہ تیار کیا گیا۔ مولانا مسعود علی نے اعظم گڑھ میں قیام منظور کیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے اخبارات میں مضامین لکھ کر دارالمصنفین کے قیام کی اطلاع دی اور ملک کے مشاہیر و اکابرین سے خط و کتابت کر کے ان سے اشتراک و تعاون کی اپیل کی۔ دارالمصنفین کے حسب ذیل مقاصد قرار دیئے گئے۔

---

۱ مکاتیب شبلی حصہ اول، مکتوب بنام حبیب الرحمن شیروانی

۲ مکاتیب شبلی حصہ اول، مکتوب نمبر ۱۱۳، بنام مولانا حبیب الرحمن شیروانی ص ۲۰۸

۱۔ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔
۲۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ
۳۔ تصنیف شدہ کتابوں اور دیگر علمی و ادبی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا۔ مولانا حمید الدین فراہی کی کوششوں سے سرکار نظام نے وظیفہ کی ماہوار رقم جاری کر دی لیکن دارالمصنفین کی باقاعدہ رجسٹری ضروری قرار دی۔ ملک کے اعتماد کے لئے بھی اس کے رجسٹر کرانے کی چنداں ضرورت تھی اس لئے جون ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں "دارالمصنفین، شبلی اکاڈمی" کے نام سے اس کی باقاعدہ رجسٹری کرائی گئی اور اس کے بعد اس کا کام بھی باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے پندرہ اراکین کی ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل عمل میں آئی جو ملک کے سربرآوردہ اہل قلم پر مشتمل تھی۔ اس کی صدارت نواب عماد الملک بہادر نے قبول فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں اور وقیع عطیات سے درالمصنفین کی امداد فرماتے رہے۔ جسٹس کرامت حسین نے نائب صدر ہونا قبول فرمایا، موصوف نے اپنے قیمتی مشوروں سے خصوصاً علوم جدیدہ کی ترتیب و تالیف کے اصول مرتب کئے، اس مجلس انتظامیہ سے ایک مجلس عاملہ بنائی گئی جس کی صدارت مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کو تفویض ہوئی جن کا وجود تمام عمر دارالمصنفین کے لئے سرمایہ اعتماد بنا رہا۔ مجلس عاملہ پانچ اراکین پر مشتمل تھی جس کے ہاتھ میں دارالمصنفین کے تمام کاروبار کا انتظام تھا۔

مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبد السلام ندوی کے علاوہ جناب حامد نعمانی خلف علامہ شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، نواب سید علی حسن خان لکھنؤ پروفیسر شیخ عبد القادر صاحب، پونہ، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب، لاہور، نواب عماد الملک سید علی حسن خاں بلگرامی، مولانا عبد اللہ عمادی اور مولانا عبد الماجد دریابادی کو دارالمصنفین کا رکن اساسی منتخب کیا گیا۔

مولانا حمید الدین فراہی کے بعد منصب صدارت پر نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا عبد الماجد دریابادی جیسے مشاہیر علم و ادب فائز ہوگئے۔ دارالمصنفین کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی بھی عالم گیر شہرت کے حامل رہے۔ ان کے جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبد الرحمٰن ہوئے جنہوں نے ہندوستان گیر شہرت پائی۔ اس وقت بھی نواب مکرم جاہ بہادر اور دنیائے اسلام کے نامور عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی منصب صدارت پر فائز ہیں۔

دارالمصنفین کے شعبے :- دارالمصنفین کے تحت مندرجہ ذیل شعبے ہیں۔

(۱) دارالتصنیف (۲) دارالاشاعت (۳) دارالطباعت (۴) شعبہ رسالہ معارف (۵) دارالکتب (۶) اور شعبۂ تعمیرات

دارالمصنفین کی ابتدا دارالتصنیف اور دارالاشاعت سے ہوئی بعد میں حسب ضرورت و سہولت دوسرے شعبوں کا بھی اضافہ ہوتا رہا اور ہر ہر شعبہ میں بتدریج اصلاح و ترقی بھی ہوتی رہی۔

دارالتصنیف :- اس میں اولاً ایسے متعدد رفقاء و مصنفین ہیں جو مستقلاً دارالمصنفین سے وابستہ ہیں ان کے علاوہ باہر سے جو مصنفین و مترجمین اپنی کتابیں شائع کرنے کے لئے بھیجتے ہیں وہ بشرط پسندیدگی یا معاوضہ یا بلا معاوضہ شائع ہوتی ہیں، شروع میں اس شعبہ سے صرف دو بزرگ وابستہ ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی دکن کالج پونہ کی پروفیسری کو خیرباد کہہ کر تشریف لائے تھے اور مولانا عبد السلام ندوی الہلال کلکتہ کے شعبۂ ادارت سے۔ ان کے علاوہ اب تک اس شعبہ کو جن ممتاز ارباب قلم اور مشہور

مصنفین کی خدمات حاصل ہوتی رہی ہیں ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ۲۔ مولانا سعید انصاری ۳۔ مولانا حاجی معین الدین ندوی ۴۔ مولانا ابوالحسنات ندوی
۵۔ مولانا ابوالجلال ندوی ۶۔ سید نجیب اشرف ندوی ۷۔ مولانا ابو ظفر ندوی ۸۔ مولانا سید ریاست علی
۹۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ۱۰۔ ڈاکٹر محمد عزیز ۱۱۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۱۲۔ ڈاکٹر محمد یوسف کوکن
۱۳۔ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی ۱۴۔ مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی ۱۵۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۱۶۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی
۱۷۔ مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی ۱۸۔ حافظ عمر الصدیق دریابادی ۱۹۔ مولوی محمد عارف عمری ۲۰۔ مولوی منصور علی ندوی مرحوم
۲۱۔ پروفیسر مولانا عبدالباری ندوی (مرحوم)

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین کے ناظم علمی اور مولانا مسعود علی ندوی ناظم انتظامی رہے۔ ان کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور موجودہ ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی ہیں۔ انتظامی امور کے فرائض و ذمہ داریاں جناب سید شہاب الدین دسنوی انجام دے رہے ہیں جن کی معاونت پروفیسر عبدالمنان ہلال کر رہے ہیں۔

ناموں کی فہرست پر نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالمصنفین کے قیام کے زمانے ہی سے اس کو ملک کی برگزیدہ علمی جماعت کی خدمات حاصل ہو رہی ہیں اور انگریزی داں اور عربی داں دونوں قسم کے لوگ دارالتصنیف کی ہیئت ترکیبی کے جز ہیں۔

اب تک دارالمصنفین میں مخصوص رفقائے دارالمصنفین اور اس کے رفقائے اعزازی نے جو کتابیں تالیف کی ہیں ان کو مختلف النوع موضوعات سے تعلق رکھنے کی بنا پر حسب ذیل عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سلسلہ سیرت، سلسلہ سیر الصحابہ و تابعین، سلسلہ تاریخ علوم و فنون، سلسلہ تاریخ اسلام، سلسلہ تاریخ ہند، فلسفہ تاریخ، قرآنیات، حدیث و محدثین، فقہ و فقہا، شخصیات و سوانح، فلسفہ و کلام، مقامات و خطبات، مکاتیب، ادب و تنقید، اہم عصری مسائل، سلسلہ اسلام و مستشرقین، متفرق کتابیں۔

شعبۂ تصنیف ایک اہم علمی خدمت یہ بھی انجام دیتا ہے کہ اسلامی علوم و تاریخ و عقائد و مسائل کے متعلق اطراف ملک سے جو سینکڑوں استفسارات آئے دن آتے رہتے ہیں نہایت تحقیق کے ساتھ ان کے جوابات لکھ کر بھیجے جاتے ہیں۔ اس مشغلہ میں رفقائے دارالمصنفین کا کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ ادارہ منفرد ہے۔

دارالمصنفین کے رفقاء و مصنفین نے تصنیف و تالیف کا معیاری اور بلند پایہ نمونہ قائم کر کے ملک کا مذاق بدل دیا جس سے ملک کے سنجیدہ اہل قلم اور مصنفین متاثر ہوئے اور اس کی عام طور پر تقلید کی گئی۔

دارالاشاعت :- اس شعبہ میں مولانا شبلی اور دارالمصنفین سے وابستہ رفقاء و مصنفین کی تصنیفات ہیں، اس وقت کتابوں کی شکل میں دارالمصنفین کا سرمایہ کئی لاکھ کا ہوگا۔ اس کی تمام مطبوعات اسی مکتبہ سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور پوری دنیا میں بھیجی جاتی ہیں دارالمصنفین کی آمدنی کا اصل ذریعہ اس کی کتابوں کی تجارت ہی ہے۔ دارالاشاعت نے اب تک دو سو سے زیادہ بلند پایہ اور محققانہ کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کی بعض کتابوں مثلاً سیرۃ النبی، سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام کو بھی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ دنیا کی کسی زبان میں سیرۃ النبی جیسی بلند پایہ کتاب نہیں لکھی گئی، الفاروق، شعر العجم، خطبات مدراس، سیرت عائشہؓ، خیام، عرب و ہند کے تعلقات، اسوہ صحابہ، سیرت عمر بن عبدالعزیز اور اقبال کامل کو بھی حیرت انگیز مقبولیت نصیب ہوئی۔ دارالمصنفین کا سلسلہ تاریخ ہند

بھی پورے ملک میں قدر و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ تاریخ ہند پر کام کرنے والوں کے لئے مستند ماخذ ہے ان کتابوں سے ملک میں اتحاد، یک جہتی اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی قائم کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ دارالمصنفین کی متعدد کتابیں مثلاً شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، شعر الہند، گل رعنا، اقبال کامل، انقلاب الامم، ابن خلدون، تاریخ اسلام، ہماری بادشاہی، مختصر تاریخ ہند، رحمت عالم اور دروس الادب وغیرہ ہندوستان و پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں اور مشرقی درسگاہوں کے نصاب میں داخل ہیں۔

دارالمصنفین کی بعض کتابوں کو نہ صرف ہندو پاک بلکہ پوری اسلامی دنیا اور یورپ کے ملکوں میں بھی اعتبار و حسن قبول ملا اور ملک و بیرون ملک کی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں، بنگالی، گجراتی، ملیالم، مراٹھی اور ہندی کے علاوہ فارسی، عربی، ترکی، پشتو اور انگریزی میں بھی اس کی کتابوں کے ترجمے طبع ہو کر مقبول ہوئے۔

دارالمصنفین کا بنیادی مقصد اردو زبان کی خدمت اور اس زبان میں علم و ادب کی مستند اور محققانہ کتابوں کی طبع و اشاعت ہے تاہم اس نے عربی زبان میں بھی متعدد تالیفات شائع کیں ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

الانتقاد على التمدن الاسلامی، از الشیخ شبلی نعمانی، تفسیر ابی مسلم الاصفهانی از الشیخ سعید الانصاری، اقسام القرآن المعلم عبدالحمید فراهی، اجراء شئی من تفسیر نظام القرآن از المعلم عبدالحمید فراهی، دیوان الفیض الاستاذ فیض الحسن السهارنبوری، ابوالعلا ماله و ماالیه الشیخ عبدالعزیز میمنی، مبتدیوں کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی نے دروس الادب کے نام سے دو حصوں میں ایک ریڈر اور لغات جدیدہ لکھی۔

انگریزی کی بعض کتابیں بھی دارالمصنفین کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

دارالکتب :- مولانا شبلی نے اپنا ذاتی کتب خانہ ندوۃ العلماء کو وقف کر دیا تھا اس کے بعد سیرت نبوی کی تالیف کے سلسلہ میں کچھ کتابیں آ گئیں اور مولانا کے اعزہ نے بھی اپنی کتابیں دارالمصنفین کو دے دیں لیکن کتابوں کا یہ کم سرمایہ دارالمصنفین کی وسیع ضروریات کے لئے ناکافی تھا۔ اس لئے ابتداء ہی سے کتب خانہ کی توسیع کی طرف بڑی توجہ دی گئی اور کتابوں کی خریداری کے لئے سالانہ ایک معقول رقم بھی مقرر کی گئی۔ اس طرح برسوں کی سعی و محنت کے بعد کتب خانہ مشرقی و مغربی علوم کا مجمع البحرین بن گیا ہے۔ اس وقت بھی ملک کی تازہ مطبوعات اور جدید کتابوں کا اضافہ برابر ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ عربی، فارسی اردو اور انگریزی کی منتخب اور معیاری کتابوں کا وسیع ذخیرہ ہے۔

ہندی اور فرانسیسی کی کتابیں بھی تھوڑی سی ہیں۔ قدیم عربی کتابوں کا بھی معتد بہ ذخیرہ ہے لیکن حال میں جو کتابیں تحقیق و تحشیہ اور مختلف فہارس کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں اور جن سے مراجعت میں بڑی سہولت ہو گئی ہے، ان کی اور انگریزی کتابوں کی کمی ہے۔

کتب خانہ میں مختلف فنون کی عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات بھی قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں ان میں بعض نوادر بھی ہیں۔ عربی مخطوطات کی تعداد ۲۰۵ اور فارسی مخطوطات کی ۱۴۱ ہے جو قدامت، تاریخی اہمیت یا خطاطی اور فنی اعتبار سے ممتاز ہیں

دارالطباعت :- اس کا آغاز مولانا شبلی مرحوم کی کتابوں کی طباعت سے ہوا جون ۱۹۲۱ء میں معارف پریس کے نام سے اس شعبہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ دارالمصنفین کی تمام کتابیں اس مطبع سے چھپی ہیں اس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے اہتمام، حسن طبع اور حسن مذاق پر ملک نے کافی خراج تحسین پیش کیا۔

شعبۂ معارف :- اس ادارہ کی بنیاد کے بعد ایک رسالہ کا اجراء بھی اس کا اہم مقصد تھا۔ اس رسالہ کا نام "معارف" رکھا گیا تھا۔ "معارف" کا پہلا پرچہ جولائی ۱۹۱۶ء میں نکلا تھا۔ اس وقت سے اب تک یہ الحمدللہ اپنی خصوصیات کے ساتھ جاری

ہے۔ یہ رسالہ دارالمصنفین کا ترجمان اور اس کے مقاصد کا نقیب ہے۔ "معارف" پر انشاءاللہ ایک باب اس کتاب میں شامل ہوگا

دارالمصنفین کی اہم خصوصیات -۱) دارالمصنفین پورے ملک میں اس اعتبار سے منفرد ادارہ ہے جو ہر لحاظ سے خود کفیل ہے۔ اس کے رفقاء و مصنفین دنیاوی مشاغل اور ہنگاموں سے الگ رہ کر ایثار و خلوص اور سادگی و قناعت کے ساتھ علم و فن کی خدمت میں یکسوئی سے منہمک رہتے ہیں، یہاں فارغ التحصیل طلباء کو تحقیق و تلاش، تصنیف و تالیف، غور و مطالعہ اور توسیع معلومات کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور ان کی ذہنی و دماغی تربیت اور تحریری مشق کے سر و سامان بہم پہنچائے جاتے ہیں۔

۲) دارالمصنفین کی ہر تحقیق، ہر کاوش، ہر مطالعہ، ہر غور و تجسس اور ہر تحریر کا مقصد اسلامی علوم اور اسلام کی خدمت ہے اس نے اپنا مرکزی نقطہ اسلامیت کو بنایا ہے۔

۳) دارالمصنفین نے مستند، محققانہ اور قابل مطالعہ کتابیں شائع کرنے کے علاوہ تصنیف و تالیف کا ایک معیاری اور بلند پایہ نمونہ قائم کر کے ملک کا مذاق بدل دیا جس سے اردو کے تمام سنجیدہ مصنفین اور اہل قلم متاثر ہوئے اور عام طور سے اس کی تقلید کی جانے لگی۔ دارالمصنفین کی کدو کاوش اور تحقیقی کاموں، تلاش و جستجو کا اعتراف اہل علم و نظر نے بھی دل کھول کر کیا ہے اور اس حیثیت سے اس کے مخالفین بھی اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔

۴) دارالمصنفین کی تصنیفات مختلف النوع موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے وہ ہر ذہن و دماغ اور ہر ذوق کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان ہیں۔

علامہ شبلی کی قائم کردہ یہ تصنیفی روایت یعنی دارالمصنفین ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ اور عصر حاضر میں احیائے اسلامی کا ایک بہت بڑا محرک ہے بقول سید سلیمان ندوی -

"مولانا شبلی مرحوم کا کام متعدد وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے، مرحوم جن معترضین کے جواب کے لئے اٹھتے وہ ان پڑھ مشنریوں میں نہ تھے اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب ان کے لئے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لئے ضرورت یہ تھی کہ ایک کونے سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی جائے۔ ان کے بتائے ہوئے جوابوں کی غلطی اور کمزوری بتائی جائے اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم و فنون اور تاریخ و تمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے تاکہ اسلام کی تاریخی و تمدنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے، جس سے قوم کے فسردہ دلوں میں از سر نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مائیگی کا بھی اندازہ ہو، مرحوم کا مقصد زندگی اگر یہیں تک ختم ہو جاتا تو بھی کام نسبتاً ہلکا ہوتا مگر اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علماء کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانے میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کر تا رہے۔ یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہیں۔[1]

"دارالمصنفین" کے قیام کو ۸۲ سال سے اوپر کا زمانہ بیت چکا ہے اس کی علمی خدمات عظیم الشان ہیں، یہ عظیم الشان کام ان بوریہ نشین درویشوں کا ہے جنہوں نے قلیل مشاہرے پر اپنی زندگیاں قومی مقاصد کے لئے وقف کر دیں اور کوئی دنیوی ترغیب و تحریص ان کے جذبہ ایثار و قربانی پر غالب نہ آسکی، حسن عمل اور حسن نیت کی یہ مثالیں کہاں ملتی ہیں۔

۱۔ دیباچہ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ص ۱۷ ۱۸

مراٹھی نثر کا ارتقا

(پندرھویں صدی کے نصف دوم سے بیسوی صدی کے آغاز تک)

ڈاکٹر یونس اگاسکر
صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی

مسلمانوں کی تاریخ نویسی سے دلچسپی ضرب المثل ہے۔ ہندوستان میں بھی سب سے پہلے عربوں نے جنہیں تاریخ کے محافظین میں شمار کیا جاتا ہے، اسے بہ طور فن پروان چڑھایا۔ عربوں کے بعد افغانوں اور پھر ترکوں نے اس فن کو مزید جلا بخشی۔ اہل تیمور کے دور میں تاریخ نویسی کے شوق نے اس قدر ترقی کی کہ کاروبار سلطنت کے سلسلے میں ہونے والی مراسلت کو محفوظ کرنے، روزمرہ کے واقعات کو روزناموں کی شکل میں لکھنے اور جنگوں اور معاہدوں کی تفصیلات کو سلسلے وار درج کرنے کے لئے علاحدہ علاحدہ شعبے قائم کئے گئے اور ہر شعبے کے نگرانی کے لئے ایک ماہر کا تقرر عمل میں آنے لگا۔ دکن کے سلاطین نے بھی اپنے متقدمین و معاصرین کی قائم کردہ روایتوں کو جنوبی ہند میں خوب وسعت دی۔

مراٹھوں نے دیگر امور سلطنت کی طرح تاریخ نویسی کی روایت بھی مسلمانوں سے مستعار لی۔ انہوں نے مغلوں اور دکنی سلاطین کی تقلید میں اپنے ہاں پنڈتوں اور کارکنوں کو ملازم رکھنا شروع کیا جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ اپنے آقا کے حکم کے مطابق جنگوں، صلحوں اور درباری احکام کی تفصیلات کو قلمبند کریں اور مختلف علاقوں کے کوائف کا تفصیل وار اندراج کر کے انہیں مرکز تک پہنچائیں۔ اس طرح مراٹھی میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔

مراٹھی میں لکھی ہوئی ان تاریخوں کو "بکھر" کہا جاتا ہے جو محققین کے خیال میں عربی لفظ 'خبر' کی تقلیب (Metathesis) ہے۔ اور ان بکھروں (یا خبروں) کو ترتیب دینے والوں کو 'بکھر کار' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ قول اتہاس اچاریہ وشوناتھ کاشی ناتھ راجواڑے: "مسلمانوں کے میل جول اور ان کی تاریخوں سے متاثر ہو کر مراٹھوں نے بھی بکھریں لکھنے کا ڈول ڈالا"۔[1]

استاذی ڈاکٹر رگھوناتھ وناپک ہیرواڈکر نے بکھروں کو تاریخی ماخذات کے طور پر دوسرے درجے کی چیز قرار دیا ہے مگر ان کی ادبی حیثیت اور بکھر کاروں کی نثری خدمات کو بہت سراہا ہے[2] پروفیسر سریش ڈولکے کے خیال میں یہ بکھریں "مراٹھی کے

---

[1] مقدمہ تاریخ (مراٹھی) حصہ اول ص ۳
[2] بکھری ادب (مراٹھی) ص ٤

تاریخی ناولوں کا ابتدائی روپ" ہیں[1]۔ لیکن ناول کے فنی لوازمات کے پیش ان بکھروں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ البتہ بکھروں کی ادبی حیثیت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اردو کی طرح مراٹھی میں بھی ابتدا میں نثری تصانیف بہت کم تھیں اور ان کا ادبی پایہ بھی کم تر تھا۔ بکھروں نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ مراٹھی نثر کی رفتار ترقی کو بھی متعین اور تیز کر دیا۔

بکھری ادب کی ابتدا کا دور وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں مسلمانوں کے قدم مستحکم ہو چکے تھے اور ان کی تہذیب کے پھیلاؤ کے ساتھ ان کی زبانوں کے الفاظ بھی مقامی زبانوں کی طرف سیلاب کی طرح بڑھ رہے تھے چنانچہ بکھروں میں بھی عربی، فارسی اور ترکی الفاظ اپنی تہذیبی انفرادیت اور شیرینی و نمکینی کے ساتھ صفحے صفحے پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ بکھر کار عموماً دربار ی منشی ہوا کرتے تھے جو فارسی میں بھی درک رکھتے تھے۔ مسلمانوں سے مراٹھوں کی مراسلت عموماً فارسی میں ہوا کرتی تھی اس لئے ان کی مراٹھی بھی فارسی سے متاثر ہوتی تھی۔ اس کی نتیجہ یہ نکلا کہ مراٹھی نثر کا اسلوب وسیع امکانات کا حامل بن گیا۔ اس کا ادبی معیار بلند ہو گیا اور بکھر ایک منفرد صنفِ ادب کی حیثیت سے مراٹھی کے کلاسیکی ادب کا قابلِ فخر سرمایہ قرار پائی۔ دو ابتدائی بکھروں "مہی کاوتی چی بکھر" اور "راکشش تاگڈی چی بکھر" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہیرواڈکر نے تحریر فرمایا ہے۔ "بدیسی الفاظ و اصطلاحات کے استعمال سے مراٹھی زبان ثروت مند ہو گئی ہے"[2]

اس میں شبہ نہیں کہ مراٹھی میں بکھریں لکھنے کا رواج مغلوں اور ایرانیوں کے زیرِ اثر شروع ہوا اور ان میں فارسی کے الفاظ و اسلوب کا رخ جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے مگر محض اس بناء پر مراٹھی بکھر کو ایک مستعار صنف سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ بکھر ایک خالص مراٹھی صنفِ ادب ہے جو اپنے اسلوب کی گھلاوٹ، تاثر کی شدت اور مشاہدے کی مقامیت کے ساتھ ساتھ حسنِ زبان و زورِ بیان کے اعتبار سے دنیا کے بہترین ادب کا ایک حصہ قرار دی جاسکتی ہے۔

یہ بکھریں، مراٹھی میں غیر مذہبی نثر کے آغاز و ارتقا کی ذمہ دار ہونے کے علاوہ مراٹھی تہذیب کا دلکش نمونہ بھی ہیں۔ ان میں قدم قدم پر مراٹھی مزاج و ذہن جھانکتا نظر آتا ہے۔ مراٹھوں کی قومی و انفرادی خصوصیات کا واضح خاکہ ان میں ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لحاظ سے بکھریں مراٹھی تہذیب و معاشرت کی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔

افسوس مراٹھی نثر نگاری کی وہ پر شکوہ روایت جو بکھر نویسوں کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی، مراٹھا حکومت کے زوال کے ساتھ ہی بچھڑ گئی۔ انگریزی اقتدار نے اس صنف کی پشت پناہی ضروری نہ سمجھی۔ ۱۸۱۸ء میں جب آخری پیشوا باجی راؤ دوم کو تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر کے اس کی سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی تو بمبئی کے علاوہ پونے اور اس کے اطراف میں بھی انگریزی عملداری آغاز ہوا۔ نیا راگ شروع ہوا تو ساز بھی بدلے گئے، چنانچہ مراٹھی نثر نے ایک نیا موڑ لیا۔ لیکن ادبی تاریخ میں ۱۸۱۸ء کو قدیم و جدید نثر کے درمیان خط فاصل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مراٹھی نثر کے ایوان میں نئی صبح کی پہلی کرن تو اسی وقت داخل ہو چکی تھی جب کلکتے کے قریب سیرام پور (سری رام پور) کے عیسائی مشن نے ۱۸۰۵ء میں "سنت میتھیو" اور "مراٹھی بھاشے چے ویاکرن" (مراٹھی زبان کی قواعد) ان دو کتابوں کے توسط سے مراٹھی زبان کو طباعت کی راہ دکھائی۔ پھر ۱۸۱۸ء تک تقریباً دس

---

[1] ماہ نامہ 'منوہر' (مراٹھی) ستمبر ۱۹۶۶ء۔
[2] مراٹھی بکھر (مراٹھی) ص ۱۰۴۔

کتابیں یہاں چھپ کر شائع ہوئیں۔ اس لحاظ سے انیسویں صدی کے آغاز کو جدید مراٹھی نثر کی ابتداء کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ادھر مہاراشٹر میں کمپنی سرکار کی حکومت کے استحکام کے ساتھ ہی دیسی رعایا کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لئے مراٹھی میں نصابی کتب تیار کروانے اور قواعد سے متعلق کتابیں لکھوانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حکومت کی امداد سے متعدد مترجمین نے سائنس، طب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، اخلاقیات اور ادب سے متعلق انگریزی کتابوں کو مراٹھی کا جامہ پہنایا۔ آگے چل کر انہیں موضوعات پر نئے سرے سے کتابیں لکھی گئیں یا ترتیب دی گئیں جن کا سلسلہ پون صدی تک جاری رہا۔

اس دور کے بیشتر لکھنے والوں نے حکومت یا کسی ادارے کی سرپرستی اور ہمت افزائی کے نتیجے میں کتابیں لکھیں یا ترتیب دیں مگر کچھ مترجم و مصنف ایسے بھی تھے جنہوں نے محض خدمت ادب اور سماج کو مطمح نظر بنا کر تالیفات کیں اور ذاتی نقصان اٹھا کر انہیں شائع کرایا۔ ان کتابوں کی وجہ سے مراٹھی میں جدید نثر کی بنیاد استوار ہو گئی۔ اردو میں جو کام فورٹ ولیم کالج کے مصنفین و مترجمین نے کیا، مراٹھی میں وہی فرض اس دور کے مترجمین و مولفین نے انجام دیا۔

اس دور میں لفظی ترجمے سے زیادہ آزاد ترجمانی پر زور دیا جاتا تھا تاکہ مفہوم خبط نہ ہو اور زبان بھی لنگڑی نہ لگے۔ اس لحاظ سے مراٹھی نثر کا ارتقا فطری انداز میں جاری رہا اور وہ ہر قسم کے موضوعات کے ادا کرنے پر قادر ہوتی چلی گئی۔ اردو میں جس طرح سرسید کے مخالفین نے انہیں کے انداز اور اسلوب کی تقلید کرتے ہوئے ان کے مضامین کے جواب لکھے یا ان پر اعتراضات کیے اور بالواسطہ طریقے پر اردو نثر کی ترقی میں معاون ہوئے اسی طرح مراٹھی میں مشنریوں اور نو عیسائیوں کی کتابوں اور مضامین میں ہندو دھرم اور تہذیب پر کیے گئے ناروا حملوں کا جواب دینے کے لئے بیدار مغز تعلیم یافتہ ہندوؤں نے سلیس اور آسان مراٹھی کو اپنایا جس کے نتیجے میں اس میں ٹھیٹ مراٹھی کا پٹ اور اہل زبان کا محاورہ نہ صرف برقرار رہا بلکہ اس کے پروان چڑھنے کے مواقع بھی نکلتے رہے اور جدید مراٹھی نثر کا اسلوب متعین ہونے میں مدد ملی۔

اس دور کی ایک اور اہم خصوصیت وقفہ واری پرچوں (Periodicals) اور اخباروں کی اشاعت ہے جن کی وجہ سے نثر کو تیزی سے ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اگرچہ ان اخبارات و رسائل میں پرچار اور تبلیغ کا پہلو غالب ہوتا تھا اور تفریح و تفنن سے زیادہ قارئین کے ذوق علم اور اخلاقی کردار کو بڑھاوا دینے پر زور دیا جاتا تھا مگر بات کو موثر اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کے لئے تمثیلوں اور روزمرہ کی مثالوں سے مملو ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جاتا تھا جس نے آگے چل کر مراٹھی انشائیہ کو جنم دیا۔ سرسید کے "تہذیب الاخلاق" اور دیگر معاصر و مقلد پرچوں کی طرح مراٹھی میں بھی 'دگ درشن' (۱۸۴۰ء) 'پربھاکر' (۱۸۴۱ء) 'مراٹھی گیان پرسارک' (۱۸۵۰ء) اور 'اندو پرکاش' (۱۸۶۲ء) جیسے اخبارں و اور رسالوں نے صنف انشائیہ کو پروان چڑھانے میں خوب حصہ لیا۔ جدید مراٹھی نثر میں قصوں اور کہانیوں کا آغاز ۱۸۰۶ء میں کیے گئے حکایات لقمان، (Aesop's Fables) کے مراٹھی ترجمے 'بال بودھ مکتاولی' سے ہوا جو تنجور (مدراس) کے سرفوجی مہاراج (۱۷۹۸ء تا ۱۸۳۲ء) کی خواہش پر سنکھن پنڈت نے کیا۔ سرفوجی مہاراج مدراس (موجودہ تامل ناڈو) میں جا بسے ہوئے بھونسلے گھرانے کے ایک نامور حکمراں تھے، ان کا خاندانی سلسلہ شیواجی مہاراج سے جاملتا ہے۔ انہیں جب سری رام پور (سیرام پور) میں قائم کردہ لیتھو کے چھاپ خانے کا پتا چلا تو انہوں نے تنجور میں پریس منگوا کر 'بال بودھ مکتاولی' کی طباعت کا اہتمام بھی کرلیا۔

اس کتاب کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کے معلم مراٹھی پنڈت بیج ناتھ شرما کے قلم سے نکلے ہوئے سنسکرت و پراکرت کے

چار تراجم نے مل کر مراٹھی نثر میں قصہ گوئی کی بنیاد ڈالی۔ ان میں 'سنگھاسن بتیسی' (۱۸۱۴ء) کے متعدد ایڈیشن مختلف ناموں سے چھپ کر شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ 'پنچ تنتر' (۱۸۱۵ء) 'ہتوپدیش' (۱۸۱۵ء) اور 'راجا پرتاپ ادتیہ کا چرتر' (۱۸۱۶ء) میں سے اول الذکر دو کتابیں ایک سے زیادہ مرتبہ شائع ہوئیں لیکن ان تراجم پر بیج ناتھ شرما کا نام درج نہیں تھا۔

'حکایات لقمان' کا ایک اور ترجمہ بابو چھترے نے 'اساپ نیتی کتھا' کے عنوان سے ۱۸۲۸ء میں کیا لیکن ان کا نام جس کتاب کی وجہ سے زندہ ہے وہ برکنس (Berkins) کی 'چلڈرنز فرینڈ' کا ترجمہ بہ عنوان 'بال متر' (حصہ اول) ہے۔ آج کے قاری کو بال متر کی زبان قدرے کم معیاری اور مشنری انداز کی معلوم ہوگی مگر آج سے ڈیڑھ سو سال قبل انگریزی سے اتنا سلیس اور رواں ترجمہ کرنا بڑی کاوش ہے۔ مراٹھی نثر کو سنسکرت آمیز نہ بنانے کی میجر کینڈی کی پالیسی کا اثر ان کے شاگرد باپو چھترے کی تحریر پر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے باپو چھترے کو ابتدائی مترجمین میں صاحب طرز نثر نگار کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی کے تراجم میں جان بنین کی مذہبی تمثیل 'پلگرمز پروگریس' کا ترجمہ 'یاترک کرمن' بھی قابل ذکر ہے جو ہری کیشو جی نے ۱۸۴۱ء میں کیا۔ اس کتاب کی زبان پر مشنری انداز بیان کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ہری کیشو جی نے چیمبرز مورل ٹیلز کا ترجمہ 'نیتی گرنتھ' کے نام سے ۱۸۴۶ء میں کیا ہے اس کی زبان اسکولی بچوں کی سمجھ کے مطابق سادہ و سلیس رکھی گئی ہے۔

وشنو شاستری باپٹ نے نیتی درپن (۱۸۳۷ء) اور بال اپدیش کتھا (۱۸۳۸ء) کے عنوان سے اخلاق آموز حکایتوں پر مبنی دو کتابیں شائع کرائیں جن میں ترجمے سے زیادہ طبع زاد تحریروں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں 'نیتی درپن' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں بیان کردہ کہانیوں سے اس دور کی سماجی و معاشرتی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دونوں کتابوں کی زبان ہلکی پھلکی اور عام فہم ہے۔

خالص تعلیمی مقصد یا اخلاق آموزی کے پیش نظر لکھی یا ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے علاوہ محض تفریح طبع کی خاطر بھی بہت سارے قصوں کو مراٹھی کا جامہ پنایا گیا جنہوں نے آگے چل کر طبع زاد ناولوں کے لئے راہ ہموار کی۔ ان میں عرب ایرانی قصوں کو اولیت حاصل ہے۔ یہ قصے فارسی سے انگریزی یا ہندوستانی میں منتقل ہو کر مراٹھی مترجمین کے ہاتھوں میں پہنچے اور ان میں ہوڑ سی لگ گئی کہ کون کس حکایت کو سب سے پہلے مراٹھی داں قارئین تک پہنچاتا ہے۔

مراٹھی میں منتقل شدہ پہلی داستان "قصہ حاتم طائی" ہے جسے ڈنکن فوربس کے انگریزی ترجمے کی مدد سے کرشن راؤ مادھو راؤ پربھو نے "حاتم طائی چرتر" کے نام سے مراٹھی میں پیش کیا۔ ترجمے کی زبان صاف ستھری اور قواعد کی غلطیوں سے بہت حد تک پاک ہے۔ ۱۸۵۵ء میں نارائن کیشو پربھو نے سر ولیم اوسلے کے انگریزی "بختیار نامہ" کا ترجمہ "بختیار نامہ یا بختیار نامی شہزادہ اور دس وزیروں کا قصہ" کے نام سے کیا اس کے بعد عرب ایرانی قصوں کے تراجم کا سلسلہ بندھ گیا۔ بہار دانش (۱۸۶۵ء) گل اور صنوبر (۱۸۶۷ء) باغ و بہار (۱۸۶۹ء) پرشین نائٹس (۱۸۷۳ء) اور گل بکاولی (۱۸۷۳ء) وغیرہ حکایتیں اور داستانیں یکے بعد دیگرے شائع ہو کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچیں اور مقبول ہوئیں۔

ان سب میں بے پناہ مقبولیت کا سہرا 'الف لیلہ' کے سر ہے جو پہلی مرتبہ کرشن شاستری چپلون کر کے پر زور قلم کے توسط سے مراٹھی میں منتقل ہوئی۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک اس کے اولین پانچ حصے چھپ کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچے اور ان کے دلوں کو جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ آج بھی اس ترجمے سے بہتر ترجمہ ملنا مشکل ہے۔ میر امن کی 'باغ و بہار' کی طرح کرشن شاستری چپلون کر کے ترجمہ 'الف لیلہ' کو جدید مراٹھی نثر کے کلاسک میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس ترجمے کے اسلوب سے متعلق مراٹھی کے ایک مستند

ادیب کیر و پنت چھترے کا یہ ریمارک قابل توجہ ہے۔

"جسے کم سے کم الفاظ استعمال کر کے دل چسپ اور زیادہ سے زیادہ پر معنی زبان لکھنے کا ڈھنگ سیکھنا ہو، وہ شاستری بوا سے سیکھے" [1]

ان داستانوں کے مافوق فطرت عناصر، رومانی و عشقیہ بیانات اور دل چسپ پلاٹ نے مراٹھی داں عوام کے دلوں کو موہ لیا۔ مراٹھی کے ادیبوں نے بھی اس مقبولیت سے متاثر ہو کر ان تراجم کو اپنی طبع زاد تخلیقات کے سلسلے میں رہنما بنانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں مراٹھی فکشن کا دھارا ایک خاص رخ پر بہنے لگا۔ خاص طور سے 'گل بکاولی' کو اس سلسلے میں سب سے پسندیدہ قصہ سمجھا گیا اور طبع زاد ناول نگاروں نے بھی اس کا اسلوب اپنانے کی کوشش کی۔

دوسری طرف انگریزی کے کلاسیکی ادب کو بھی مراٹھی میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں مافوق فطرت عناصر کی چاٹ کم ہو گئی اور ٹھوس حقائق اور معاشرتی مسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہونے لگی۔ چارلس لیمب کی شیکسپئر کی کہانیاں، مراٹھی میں منتقل ہو کر عوام تک پہنچیں۔ س۔ پ۔ پنڈت نے 'اجین کا تاجر' کے عنوان سے مرچنٹ آف وینس کو ۱۸۶۸ء میں مراٹھی میں ڈھالا۔ ڈینیل ڈیفو کے 'رابنسن کروزو' کو راوجی شاستری گوڈبولے نے مراٹھی عوام سے روشناس کرایا۔ ہری وامن بروے نے 'حیات رچرڈ' اور "ایوان ہو" کے ترجمے کے توسط سے والٹر اسکاٹ کو ۱۸۷۶ء میں مراٹھی میں پیش کیا۔ انگریزی کے مشہور ڈراموں کو مراٹھی ڈرامے کے ملبوس میں پیش کرنے کا سلسلہ بھی اسی دور میں شروع ہوا جو کسی نہ کسی حد تک آج بھی جاری ہے۔

مراٹھی میں فکشن کا آغاز انہیں تراجم کے زیر اثر ہوا۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ۱۸۷۵ء یعنی پون صدی کے عرصے میں مشرق و مغرب کے فکشن کی بیشتر اصناف مراٹھی میں متعارف ہوئیں اور مراٹھی فکشن کی راہیں روشن کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ خاص طور سے ناول اور افسانے کے لئے میدان ہموار کرنے میں ان تراجم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

زبان اور اسلوب کے اعتبار سے اس پون صدی کا ادب تین دھاروں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے جو کچھ دور تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں پھر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ دھارے حسب ذیل ہیں۔

بکھری اسلوب : یہ اسلوب اس طرز بیان کی کڑی ہے جو پیشواؤں کے دور میں بکھر کاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔ اس میں فارسی کے الفاظ و اصطلاحات کے علاوہ تاریخی طرز بیان کی جھلک نظر آتی ہے۔ انگریزی داں مراٹھی نثر نگاروں سے اس اسلوب کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اس دور کے بعض نثر نویسوں نے بکھر کاروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نیم تاریخی و نیم مذہبی واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ انہوں نے جب ترجمہ کے لئے قلم اٹھایا تو اسی اسلوب کو اپنے لئے نمونہ بنایا لیکن اس اسلوب کی مکمل عکاسی بہت کم ترجموں میں نظر آتی ہے۔ نیز اس دور میں بکھریں بھی اس قدر کم لکھی گئیں کہ اس اسلوب کو کوئی خاص پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

مشنری اسلوب : محض اخلاقی موضوعات اور عیسائیت کی تبلیغ کو پیش نظر رکھ کر لکھی یا ترجمہ کی گئی کتابوں میں اس اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے چونکہ مشنریوں نے سب سے پہلے اس قسم کی کتابیں لکھیں اس لئے اس اسلوب کا نام مشنری اسلوب،

---

[1] بہ حوالہ 'جدید مراٹھی نثر کا پس منظر' (مراٹھی) گنگا دھر بال کرشن سردار ص ۴۵

پڑ گیا۔ اس اسلوب میں تکلف سے گریز، سادگی و صفائی او واقعیت پسندی کے ساتھ ساتھ بات بات پر نصیحت کرنے اور پڑھنے کے بعد نتیجہ نکالنے کا واعظانہ اور خطابتی انداز پایا جاتا ہے۔ اس اسلوب کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے مراٹھی نثر کو پر تکلف اور پر تصنع انداز کے چپاک سے چھڑا کر سلاست و صفائی کے راستے پر ڈالا، قدیم نثر کی مشکل پسندی یا داستانوی انداز بیان کی بھول بھلیوں سے نکال کر اسے حقیقت کی صحت مند فضا میں سانس لینے کی آزادی دلائی۔ البتہ اس کی خشکی و صلابت بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔

داستانی اسلوب: اس طرز بیان میں مشکل پسندی، تصنع و تکلف، تخیل آمیزی اور ذہنی عیش کوشی کی جھلکیاں ملتی ہیں جو جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ عناصر ہیں۔ اس اسلوب کو پروان چڑھانے میں سنسکرت کے منظوم ناٹکوں اور عرب ایرانی قصص کے تراجم نے بہت مدد کی ہے۔ آگے چل کر انگریزی کے تراجم نے اس میں حقیقت پسندی کے عنصر کو شامل کیا اور اختصار کی راہ دکھائی۔ نتیجے میں مافوق فطرت عناصر کی تحیر خیزی اور انگریزی کی رومانویت اور اختصار نے مل کر اس طرز کو اس وقت کا مقبول ترین اسلوب بنادیا۔ اس طرز نگارش میں سینکڑوں کتابیں لکھی اور ترجمہ کی گئیں۔ شکست خوردہ، بے چین، مستقبل کے بارے میں مضطرب اور متشکک مہاراشٹریوں کے تھکے ہوئے ذہنوں کو اس اسلوب نے بڑی تسکین پہنچائی۔

داستانوی اسلوب نے آگے چل کر مشنری اسلوب کو اپنے اندر ضم کر لیا جس کے نتیجے میں ایک ایسے طرز بیان نے جنم لیا جس میں تاثیر کے ساتھ ساتھ ایک قوت کا احساس ہوتا ہے، جو ٹھوس ہونے کے ساتھ ساتھ نکیلا ہے اور اختصار اور تحیر کی خصوصیات سے یکساں طور پر مملو ہے۔ اسی اسلوب میں مراٹھی کے پہلے ناول و افسانہ نگار ہری بھاؤ آپٹے نے اپنے زور قلم سے 'اوشاکال' (وقت سحر)' می' (میں) اور "پن لکشات کون گھیتو؟" (کون پرواہ کرتا ہے؟) جیسے شاہ کار ناول تخلیق کر ڈالے جن کا مراٹھی ادب میں وہی مقام ہے جو اردو میں نذیر احمد کے 'توبة النصوح'، مرزا رسوا کے 'امراؤ جان ادا' یا عبدالحلیم شرر کے 'فردوس بریں' کو حاصل ہے۔

انیسویں صدی سے قبل مراٹھی میں نثر کی آبرو بکھری ادب سے قائم تھی لیکن اس میں تنوع اور ہم رنگی کم تھی۔ بکھروں کے علاوہ نثری ادب دستاویزوں اور مذہبی تعلیمات و قصص پر مشتمل تھا اس میں موضوعاتی رنگارنگی اور وسعت پیدا کرنے کا سہرا، انیسویں صدی کے مترجمین و مولفین کے سر ہے جن کی کوششوں سے مراٹھی نثر تاریخ و جغرافیہ، ادب و صحافت اور دیگر علوم و فنون کے تقاضوں کو پورا کرنے پر قادر ہو گئی۔ اس کا ہمہ گیر سالہ ارتقا ایک نسل کے پروان چڑھنے کے مترادف ہے۔ ابتدا میں اس نے انگریزی کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا اس وقت اس کی چال میں لڑکھراہٹ اور ڈگمگاہٹ نمایاں تھی۔ جب اس کے پیروں میں الفاظ کی طاقت پیدا ہوئی تو اس نے انگلی چھوڑ کر محض انگریزی کے نقش قدم پر نظر جما جما کر چلنا شروع کیا۔ اس چال میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ پھر اس پر خیالات کا شباب آیا تو اس نے محاورات، تشبیہات اور استعارات کے زیوروں سے اپنے حسن میں اضافے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اپنی پختہ عمر بہنوں خصوصاً سنسکرت کے صندوقچوں پر ہاتھ صاف کیا۔ غرض کہ جوانی میں انگریزی کی چال ڈھال، سنسکرت کے النکار، فارسی کی شیریں دہنی اور ٹھیٹ مراٹھی کی بے باکی نے اس کے حسن میں وہ قیامت بھر دی کہ وشنو شاستری اور بال گنگادھر تلک جیسے بانکے چھیلے نوجوان بھی اس کے عاشقوں کی صف اول میں نظر آنے لگے۔

مراٹھی میں طبع زاد ناول نگاری کا آغاز باباپدمن جی کے ناول 'یمنا پریٹن' (یمنا کا سفر) سے ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء میں پہلی

مرتبہ کتابی شکل میں چھپ کر شائع ہوا۔ باباپدمن جی ایک نوعیسائی تھے کہا جاتا ہے کہ ان کے ہندو سے عیسائی ہو جانے پر ان کی ہندو بیوی تبدیلی مذہب پر آمادہ نہ ہوتے ہوئے ان سے علاحدگی کی طالب ہوئی۔ اس نے نان نفقہ کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بابا پدمن جی کو اس مقدمے کا خرچ چلانے کے لئے یہ ناول لکھنا پڑا۔ اگر انہیں لکھنے پڑھنے کا شوق نہ ہوتا تو مراٹھی ناول کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ باباپدمن جی ایک ناول نگار سے زیادہ پرچارک اور مصلح ہیں اور انہوں نے ہندو دھرم کی بے جا رسوم وقیود اور بیواؤں کی شادی کے مسئلے کا سہارا لے کر ایک نیم اصلاحی و نیم تبلیغی ناول لکھ ڈالا ہے۔ اس ناول میں جگہ جگہ بیواؤں کے قصے، ہندو رسوم و عقائد کے خلاف تقریریں اور عیسائیت کی مدح وستائش اور اخلاقی نصیحتیں اس طرح پروئی گئی ہیں کہ بعض ناقدین نے اسے ناول کا درجہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تکنیکی اعتبار سے 'یمنا پریٹن' ناول کے مسلمہ معیاروں پر پورا نہیں اترتا لیکن تھیم، پلاٹ اور واقعات کے تسلسل کے اعتبار سے یہ قصہ ناول کے فن سے بہت قریب ہے۔ علاوہ ازیں شری ل۔ م۔ بھنگارے کے الفاظ میں

"اگرچہ مختلف بیواؤں کے قصے الگ الگ ہیں، لیکن ان سے یمنا پر ہونے والے اثرات کی وحدت کے پیشِ نظر باباپدمن جی کی تخلیق کو ناول کہنا ہی مناسب ہوگا" [1]

'یمنا پریٹن' کے بعد لکھے جانے والے طبع زاد ناولوں میں لکشمن شاستری ہلبیے کا 'مکتامالا' سب سے اہم ہے جسے انہوں نے اتہاس یعنی تاریخ کہا ہے۔ یہاں ہمیں مرزا رسوا یاد آتے ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں کو "ہمارے دور کی تاریخیں" کہا ہے۔

ہلبیے نظریات کے اعتبار سے سماجی مصلح تھے اس لئے پونے دو سو صفحے کے ناول میں انہوں نے سماج سدھار کے پرچار کے لئے تقریر کرنے کے مواقع خوب نکالے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شاستری اور سنسکرت کے ماہر تھے اس لئے انہوں نے ہر باب کے آغاز میں سنسکرت کے اشعار یا اشلوک بھی چسپاں کئے ہیں جو پورے باب کا خلاصہ یا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔ 'مکتامالا' میں بھی داستانوں کی طرح وحدتِ زمان کا خیال نہیں رکھا گیا ہے اور واقعات کی پیشکش میں بھی منطق سے زیادہ اتفاقات پر انحصار کیا گیا ہے۔ لیکن اس ناول نے مراٹھی کے دیگر ناول نگاروں کی توجہ اس صف کی طرف مبذول کرانے میں جو کامیابی حاصل کی وہ اسے تاریخی اہمیت کا حامل بنا گئی ہے۔

ہلبیے کا دوسرا ناول 'رتن پربھا' ۱۸۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں یمنا پریٹن' کی طرح 'پنردواہ' یا بیواؤں کی شادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ لیکن اس ناول میں تکنیکی صفائی اور پلاٹ کا دروبست 'مکتابالا' سے بھی کم ہے۔ اس کے باوجود ہلبیے مراٹھی کے پہلے ناول نگار ہیں جن کے ہاں پلاٹ کا تصور اور ناول کی تکنیکی بندشوں کا نامکمل ہی سہی لحاظ ملتا ہے۔

اس دور کے ایک اور اہم ناول نگار نارو سداشیو رسیوڈے ہیں جن کے ناول 'منجو گھوشا' کو مکتامالا سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا سبب واقعات کا تسلسل اور تخیل کی پر زور اڑان ہے جو قاری کی توجہ جذب کیے رہتی ہے۔ رسیوڈے کا دوسرا ناول 'وشواس راو' ماحول کے لحاظ سے حقیقت سے قریب ہے لیکن تیسرا ناول 'وسنت کوکلا' جو اُن کے مرنے کے بعد ان کے بھائی کیشو سداشیو رسیوڈے نے مکمل کیا، تخیل کی اڑان میں بہت اونچا نکل گیا ہے۔ اس میں داستانوی اسلوب اور تمثیلی انداز بہت نمایاں ہے۔

ایک اور دلچسپ ناول 'وچتر پُری' جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا، اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ اس میں بہ قول پروفیسر اَ۔ نا۔

---

[1] مراٹھی ادب کی تاریخ (مراٹھی) باب ہفتم ص ۲۱۲

ڈیش پانڈے "مافوق فطرت عناصر کا مذاق اڑایا گیا ہے" [1] اس ناول میں داستان اور ناول کی ملی جلی تکنیک کا استعمال کر کے مصنف کیشو لکشمی زورو لیکر نے مراٹھا عہد اور انگریزی دور کے تہذیبی عناصر کی کھچڑی بنائی ہے اور کلکتہ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو طلسماتی حادثات سے دوچار ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔

ایک خاتون ناول نگار کی اولین کوشش کے طور پر شریمتی سالو بائی تانبولے کر کا ناول 'چندر پربھاوروورنن' (چندر پربھا کا بیان ہجر) مراٹھی ناول کی تاریخ میں قابل ذکر تخلیق سمجھی جاتی ہے اس ناول میں قصہ حاتم طائی، کی طرح پہیلی نما سوالات سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور ہیرو ہیروئن کے ملاپ پر ناول اختتام پذیر ہوتا ہے۔

مراٹھی کا پہلا تاریخی ناول را۔ بھی۔ گنجی کر کا موچن گڈ، ہے جو ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں دورِ شیواجی کو پس منظر بنایا گیا ہے۔ گنجی کر نے تخیل کے سہارے قدیم ماحول کی تخلیق میں کافی کاوش کی ہے اور کرداروں کے عمل اور مکالمے میں بھی قدامت کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس دور کا دوسرا اہم تاریخی ناول، وشنو جناردن پٹوردھن کا "ہمبیر راو آنی پتلی بائی" (۱۸۷۳ء) ہے جس میں ناناصاحب پیشوا کی جہدِ آزادی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس ناول کی ایک قابل ذکر دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مغل سپاہی فارسی آمیز اردو بولتے ہیں اور ایک عام مراٹھا سپاہی 'سبھان راو کاشتکاروں کی بولی بولتا نظر آتا ہے۔

مراٹھی کے پہلے بڑے ناول نگار ہری ناراین آپٹے ہیں جنہیں عرف عام میں ہری بھاؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہری بھاؤ انیسویں صدی کی دو اہم تحریکوں، سماجی اصلاح اور قوم پرستی سے متاثر فن کار تھے۔ ناول نگاری میں وہ رینالڈز اور والٹر اسکاٹ جیسے انگریزی کے دوم درجے کے فن کاروں سے متاثر تھے لیکن مراٹھی کے نقاد انہیں مراٹھی کا سب سے بڑا ناول نگار سمجھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں انیسویں صدی کے ناول نگاروں میں ہری بھاؤ سب سے اہم مقام کے مالک ہیں۔ ہندو بیواؤں کی دردناک حالت پر ان کا ناول "پن لکشیات کون گھیتو" (کون پرواہ کرتا ہے) مہاراشٹر کے برہمن طبقے کی بے مثال عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح 'می' (میں) انیسویں صدی کے سماجی مسائل اور سماجی اصلاح کی تحریک کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ ان کے تاریخی ناولوں میں 'اوشاکال' (وقت سحر) ان کے اسلوب اور فکر کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

ہری بھاؤ نے مراٹھی نثر کو فکشن کی راہ پر اتنا آگے بڑھادیا کہ ان سے قبل کی ترجمہ کی کوکھ سے جنمی نثر بہت پیچھے رہ گئی۔ ان سے پہلے کی نثر میں دو پہلو نمایاں تھے۔ مشکل پسندی سے مملو کلاسیکی انداز بیان جس پر سنسکرت اور فارسی دونوں کا اثر کم وبیش پایا جاتا تھا اور انگریزی طرز سے متاثر انداز تحریر جس میں مشنیری طرز کی جھلک بھی ملتی تھی۔ ہری بھاؤ نے ان دونوں پہلوؤں سے دامن چھڑا کر مراٹھی نثر کو ایک طبع زاد انداز دیا جس میں زندگی کے متعدد رنگوں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ہری بھاؤ کی طبیعت کی شوخی، ان کی باریک بینی، ان کا سماجی شعور اور ان کا خلاقانہ جوہر اس انداز تحریر میں نمایاں ہے۔ اگرچہ اس میں تجرباتی اٹھیج کا ان گھڑ اور کھردرا طرز اظہار بھی ملتا ہے مگر مجموعی طور پر یہ نثر حقائق کی پیش کش میں سلاست وروانی اور نرمی وگداز کے استعمال سے دلکش اور خیال آفریں ہوگئی ہے۔

ہری بھاؤ سے قبل مراٹھی میں پند آموز حکایتوں یا مافوق فطرت عناصر سے مملو داستانوں کا زور تھا۔ مراٹھوں کے زوال کے بعد مہم جوئی اور قسمت آزمائی کے راستے بند ہوگئے اور انگریزی دور کے امن وامان نے محض خیالی فتوحات کے لئے میدان کھلا رکھا تھا

---

[1] جدید مراٹھی ادب کی تاریخ (مراٹھی) حصہ اول ص ۲۰۱

اس لئے نا قابل یقین اور غیر منطقی واقعات پر مبنی قصوں یا اخلاقی حکایتوں سے تسکین قلب و ذہن حاصل کرنے پر طبیعتیں مائل ہو گئیں۔ ان قصوں میں انجام ہمیشہ حق کی فتح اور باطل کی شکست پر مبنی ہوتا تھا۔ طربیہ کا دور دورہ تھا۔ المیہ تقریباً مفقود تھا۔ کردار نگاری کا فقدان تھا، مبالغہ آمیزی، فرسودہ تشبیہات و استعارات کی بھرمار اور بندھے ٹکے اسلوب کے سبب نثر کے امکانات بہت محدود ہو گئے تھے۔ شری کا۔ با۔ مراٹھے کے الفاظ میں

" جتنے مرد ہیں، مدن (حسن کا دیوتا) کے پتلے، جتنی عورتیں ہیں ساری تلوتمائیں (حسن کی مورتیں) ہر غم کے موقعے پر موت کا سا سوگ اور ہر خوشی کے موقع پر سورگ کا سا آنند۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کے سوا کوئی تشبیہہ ہی نہیں سوجھتی تھی"۔ [1]

ہری بھاؤ نے ان ساری خامیوں کو دور کیا۔ منتخب و موزوں الفاظ میں واقعے یا منظر کو پیش کرنے کی طرح ڈالی، مکالموں میں ماحول اور کردار کی مطابقت پر توجہ دی، تصنع و تکلف اور آورد سے دامن چھڑایا اور مراٹھی نثر کو اپنے ناولوں اور کہانیوں کے ذریعہ فکشن کے میدان میں جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنایا۔

مراٹھی میں مختصر افسانے کا آغاز انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ہوا جب وقفہ واری پرچوں نے پہلی مرتبہ طبع زاد کہانیاں شائع کرنی شروع کیں۔ چنانچہ 'دگ درشن' (۱۸۴۰ء) اور 'گیانودے' (۱۸۴۲ء) نامی رسالوں نے اکا دکا کہانیاں اپنے قارئین کی تفریح و ذہنی و اخلاقی تربیت کے لئے چھاپیں۔ بعد میں 'گیان پرسارک' نے قدرے مستقل انداز میں کچھ طبع زاد اور کچھ مترجم افسانے شائع کئے۔ مراٹھی کہانی کے مشہور ناقد اور مورخ رام کولار کر کے خیال میں مراٹھی کی پہلی طبع زاد مکمل کہانی 'وشنو گھنشیام' کی تحریر کردہ تھی جو گیان پرسارک کے چار شماروں میں قسط وار شائع ہوئی۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۷ء تک گیان پرسارک نے کل سترہ طبع زاد کہانیاں پیش کیں جن میں 'چھایا کی گواہی' 'بیٹے کا سوگ' 'گمشدہ رتن' اور 'چھوٹا بابو' جیسی تحیر آمیز کہانیاں بھی شامل ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں جاری ہونے والے دودھ 'گیان وستار' نے ۱۸۸۹ء تک کل بارہ کہانیاں شائع کیں۔ ۱۸۸۶ء سے 'منورنجن' اور 'نبندھ چندر کا' رسالے شائع ہونے لگے جن میں شامل ہونے والی کہانیاں معیار کے اعتبار سے بلندی اور تکنیک کے لحاظ سے تکمیل کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔

صحیح معنوں میں مختصر افسانہ مراٹھی کے اولین بڑے ناول نگار اور افسانہ نویس ہری نارائن آپٹے کے جاری کردہ رسالے 'کرمنوک' (تفریح) میں شائع شدہ ان کہانیوں کے بطن سے وجود میں آیا جو انہوں نے " سپھٹ گوشٹی" یا مختصر کہانیاں کے عنوان سے اس رسالے میں ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۰ء تک شائع کیں۔ ان میں طویل اور مختصر دونوں قسم کی کہانیاں شامل ہیں۔ ہری بھاؤ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی کی اہم تحریکوں، سیاسی آزادی، سماجی اصلاح اور قوم پرستی سے متاثر فن کار تھے اور انہوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں ان تینوں رجحانات کی کم و بیش عکاسی کی ہے لیکن ان کی کہانیوں میں سماجی موضوعات اور سوشیل ریفارم کا پہلو نمایاں ہے۔ خاص طور سے متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے مسائل کو انہوں نے بار بار پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں "سچی یا جھوٹی" "وہ دن کیسے بیتے؟" "بڑا برا وقت آگیا" "چھوٹی سی غلطی کا بھیانک انجام، پہلی لڑائی، اور "ڈسپیشیا" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں "برا وقت آگیا" قحط کے بھیانک پس منظر پر استوار کہانی ہے جس کے ذریعہ ہری بھاؤ نے انگریزوں کی ہندوستان دشمن معاشی پالیسی اور استحصال پر بالواسطہ ڈھنگ سے تنقید کی ہے۔ اس کہانی میں دیہی زندگی کا بڑا حقیقت پسندانہ اور دردناک نقشا مصنف نے

---

[1] ناول اور ناٹک پر مقالہ (مراٹھی) ص ۱۸

کھینچا ہے۔ فنکاری اور مقصدیت کا مجموعہ سنگم اس طویل مختصر افسانے میں نظر آتا ہے۔

ہری بھاؤ آپٹے کو موجودہ مختصر افسانے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں تکنیک اور تاثر کے اعتبار سے کامیاب تجربے ملتے ہیں۔ سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ تحیر آمیزی اور عام فہم زبان کے باوجود دلچسپی کے عناصر نے ان کے افسانوں کو کامیابی اور مقبولیت سے ہم کنار کردیا۔ مراٹھی نثر کو سماجی موضوعات کی پیش کش کے لئے راست اور سلیس انداز بیان سے متعارف کرا کے تخلیقی سفر پر گامزن کرنے کا سہرا ہری بھاؤ کے سر ہے۔ خاص طور سے دور ترجمہ کی رومان پرور کہانیوں کے پر تصنع انداز اور جنس آمیز بیانات سے دامن بچا کر مراٹھی افسانے کو اردگرد کے ماحول کو جذب کرنے کے لائق بنانا، ان کی بڑی خدمت ہے۔

مراٹھی نثر کے ارتقاء میں عموماً اور مراٹھی کہانی کے ارتقاء میں خصوصاً رسائل وجرائد کا نمایاں رول رہا ہے۔ یہاں تک کہ مراٹھی کہانی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اسے جن ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے انہیں مختلف رسالوں کے جاری ہو کر بند ہو جانے کے عرصے سے منسوب کرتے ہوئے ان رسالوں کے ناولوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۸۸۹ء سے ۱۹۵۱ء تک کر منوک کال کھنڈ، جو ہری بھاؤ آپٹے کے رسالے کر منوک سے منسوب ہے۔ اس کے بعد منورنجن کال کھنڈ، جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۷ء تک کے عرصے کو محیط اور رسالہ منورنجن سے منسوب ہے۔ اسی رسالے میں سب سے پہلے دواکر کرشن کے افسانے شائع ہوئے جو آپٹے کے بعد مراٹھی کے دوسرے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ منورنجن کی دوسری اہم خدمت یہ ہے کہ اس رسالے نے افسانے کو ایک آزادانہ صنف ادب کی حیثیت سے پروان چڑھایا اور اس کی اس حیثیت کو منوایا۔ اس دور کا افسانہ موضوعات کے محدود دایرے سے باہر نکل کر ساری دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اس کے علاوہ عورتوں کی کی طرف دیکھنے کا زاویہ نگاہ بھی بدلا چنانچہ وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آنے لگیں۔ بنگالی، گجراتی اور ہندی ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور رابندر ناتھ ٹیگور اور منشی پریم چند کے افسانوں کے تراجم مراٹھی میں پیش کئے گئے۔ اسی طرح انگریزی کے توسط سے ٹالسٹائی، موپاساں اور ہنری مراٹھی میں منتقل ہوئے۔

ہری بھاؤ نے کہانی کا جو روپ اور سانچا مراٹھی میں پیش کیا اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر کے اسے مقبول ترین بنانے میں وٹھل سیتارام گرجر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے بلا مبالغہ سینکڑوں کہانیاں لکھ کر اس صنفِ ادب کو مہاراشٹر کے تعلیم یافتہ طبقے کے ہر گھر تک پہنچادیا۔ طنز و مزاح، زبان کی نفاست، الفاظ کا برجستہ استعمال، قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے تحیر آمیزی اور رومان پرور ماحول کی تخلیق نے ان کو ہری بھاؤ کے مقابلے میں منفرد حیثیت کا افسانہ نگار بنادیا۔ وٹھل سیتارام گرجر نے مراٹھی نثر کو نئی زبان اور دلکش انداز بیان دیا۔ جس کی پیروی ادب برائے ادب کے حامی ناول و افسانہ نگار نا۔ سی پھڈ کے نے کی۔

بیسویں صدی میں کہانی کو نیا موڑ دینے میں دواکر کرشن کا نام سب سے اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کہانیوں میں جذبات کی عکاسی اور زندگی کی ہمہ رنگی پر زور دیا گیا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات میں زندگی کا حسن دیکھتے اور اسے بڑے سلیقے اور شاعرانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر رابندر ناتھ ٹیگور کے اسلوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں نفسیاتی تحلیل کا عنصر انہیں نئے افسانہ نگاروں کے پیش رو کا درجہ دلا سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے ربع دوم ہی سے مہاراشٹر میں انگریزی تعلیم کی طرف رغبت اور جدید دور کے تقاضوں سے مطابقت کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم نے یورپ کے ذہنی و سیاسی انقلابات کی تاریخ سے آگاہی حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے۔ سماجی بیداری اور تعلیمی ترقی کے بغیر نئے دور کے ساتھ چلنے میں کامیابی مشکل نظر آنے لگی۔ تعلیم یافتہ طبقے میں سماجی بیداری اور

معاشرتی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور اس جدوجہد کا سب سے سہل الحصول ہتھیار اخبار کی صورت میں سامنے آیا۔ یورپ کی سیاسی و ذہنی تحریکوں میں اخباروں کے نمایاں کردار سے مہاراشٹر کا ذہین پڑھا لکھا طبقہ بخوبی واقف ہو گیا تھا چنانچہ اس طبقے کے ایک سربرآوردہ بال شاستری زامبھے کر نے ۱۸۳۲ء میں 'درپن' کے نام سے پندرہ روزہ اخبار شروع کیا ان کا خیال تھا کہ شہر علم کے دو دروازے ہیں ایک یونیورسٹی اور دوسرا اخبار۔ یونیورسٹی میں داخل ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی اسلئے انہوں نے اخبار کو عوامی مفاد کے پیش نظر بنیادی اہمیت دی اور 'درپن' نکال کر جدید مراٹھی نثر کی عمارت کی بنیاد میں سیسہ پلانے کا کام کیا۔

'درپن' سے مراٹھی نثر کے ارتقا میں اخبارات کے اہم رول کا آغاز ہوتا ہے۔ اس اخبار میں مختلف عنوانات اور موضوعات کے تحت مضامین شائع ہونے شروع ہوئے۔ تاکہ عام لوگوں کی زندگی کے تاروں میں تبدیلی و ترقی کی لہر دوڑائی جاسکے۔ اس طرح نثر کو مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرنے کے لائق بنانے میں بڑی مدد ملی۔

مراٹھی نثر کا ارتقاء بہت سست اور ناقابل اعتبار رہتا اگر ۱۸۷۴ء میں 'نبندھ مالا' کا اجراء عمل میں نہ آتا۔ 'مراٹھی کے شیواجی' وشنو شاستری چپلونکر نے اس رسالے کے ذریعہ مہاراشٹریوں میں قومی افتخار اور ذہنی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ وشنو شاستری جدید تعلیم سے آراستہ اور انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے خیال میں انگریزی زبان 'شیرنی کا دودھ' تھی جسے پی کر جواں مردی اور حریت کا مادہ پیدا ہوتا تھا وہ اس دودھ کی لذت سے بخوبی واقف تھے اور اسے مراٹھی میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے 'نبندھ مالا' کا سہارا لیا اور مہاراشٹر کے تعلیم یافتہ طبقے کو جو انگریزی تہذیب کی برتری سے مرعوب اور انگریزی راج کی برکتوں کا قائل ہو کر ملک کی سیاسی غلامی کو ایک نعمت سمجھنے لگا تھا، ذہنی آزادی، وطن پرستی اور خودداری کی تعلیم دینے لگے۔ وشنو شاستری کی تحریر میں بلا کا زور اور ولولہ تھا۔ نثر تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کے والد کرشن شاستری چپلونکر 'الف لیلہ' کے مترجم کی حیثیت سے نثر پر اپنی غیر معمولی قدرت کا ثبوت دے چکے تھے۔ بیٹے نے باپ کی روایت کو اس قدر ترقی دی کہ جدید نثر کا بانی کہلایا۔

وشنو شاستری نے اپنے دو عزیز شاگردوں بال گنگادھر تلک اور گوپال گنیش آگرکر کے تعاون سے انگریزی میں 'مراٹھا' اور مراٹھی میں 'کیسری' اخبار نکالے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کے سنگِ میل کا درجہ حاصل کر گئے۔ وشنو شاستری اور تلک نے 'نبندھ مالا' اور 'کیسری' کے ذریعہ زیادہ تر مہاراشٹر کے سفید پوش طبقے کو مخاطب و متاثر کیا۔ اس وقت سماج کے پسے ہوئے اور محنت کش طبقے کے مسائل کی پذیرائی کا تصور پڑھے لکھے طبقے کے ذہن میں نہیں تھا لیکن اس کمی کو مہاتما جیوتی با پھلے کے دو شاگردوں کرشنا پانڈو رنگ بھالے کر اور ن۔ م۔ لوکھنڈے نے 'دین بندھو' جاری کر کے پورا کیا جس کی پالیسی سیاسی سے زیادہ سماجی جدوجہد کا احاطہ کرتی تھی۔

نثر کو طنز و مزاح اور تمثیلی پیرایہ عطا کرنے میں شیورام مہادیو پرانجپے کے ہفتہ وار 'کال' کو جو ۱۸۹۸ء میں جاری ہوا، غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ شیورام پرانجپے کی تحریروں پر حکومت نے پابندیاں لگائیں اور انہیں انیس مہینے کی قید کی سزا دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں کا اثر کیا رہا ہو گا اور حکومت ان سے کس قدر خوف زدہ رہی ہو گی۔ پرانجپے کی تحریر کی خوبی یہ تھی کہ وہ رمز و کنایہ اور تمثیل کے پردے میں اپنی بات کہتے اور اس میں طنز کی تیز دھار پوشیدہ رکھتے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے تلک اور آگرکر کی طرح راست اور فہمائشی انداز اپنایا تھا لیکن جیسے جیسے حکومت کا عتاب نازل ہوتا گیا، وہ اپنے قلم کی دھار کو اشاروں اور کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں اور پرلطف حکایتوں کے پردوں میں چھپا کر رکھنے لگے لیکن نشتر لگانے کا کام برابر جاری رکھا۔ مراٹھی نثر میں سیاسی طنز اور انشائیہ کی روایت کو پروان چڑھانے میں شیورام پرانجپے اور ان کے رسالے 'کال' کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ایران کا نظامِ جمال اور فنونِ لطیفہ!

ڈاکٹر شکیل الرحمن
(گڑگاؤں۔ہریانہ)

عجمی فنون کا ایک بڑا جمالیاتی نظام ہے۔اس نظامِ جمال نے وسط ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے کلچر کو صدیوں شدت سے متاثر کیا ہے۔ایران میں اسلام کے ظہور سے پہلے تمدنی اور تہذیبی آمیزشیں ہوتی رہی ہیں، بعض قدیم روایتوں کا سفر جاری رہا ہے۔اسلام کے آنے کے بعد مختلف سطحوں پر تجربوں کی آمیزشیں ہوئیں لہٰذا روایات بھی متاثر ہوئیں، نئی قدروں کی تشکیل بھی ہوئی، فکر و نظر میں کشادگی، گہرائی اور تہہ داری پیدا ہوئی، بڑی روشنی، آئی فکر و نظر میں اور زندگی کو دیکھنے اور زندگی کرنے کا تازہ، ہمہ گیر زاویۂ نگاہ پیدا ہوا۔انسان دوستی یا ہیومنزم کا تصور غیر معمولی نوعیت کا تصور تھا۔ایران نے اپنے ماضی اور اپنی روایات کے جمال کو منتخب کیا اور اسے اپنے حسن کے کشادہ، گہرے اور تہہ دار تصور سے ہم آہنگ کیا۔اس عمل میں ایران نے اپنے منفرد تشخص کا احساس عطا کیا لیکن ساتھ ہی ایک ایسی آزاد فضا کی تشکیل کی کہ بہت جلد ایک انتہائی دلکش نظامِ جمال کی صورت ابھرنے لگی جس کی پہچان ہر شعبۂ زندگی میں ہوئی۔عام معاشرتی زندگی ہو یا فوجی انتظامیہ،مذہبی خیالات واحساسات ہوں یا لباس اور طرزِ طباخی، تعمیرات کا فن ہو یا مصوری کا فن، شیشہ گری کا فن ہو یا منبت کاری اور کندہ کاری کا فن، بلور سازی اور قالین بافی کا فن ہو یا برتنوں کی تزئین کاری اور جلد سازی کا فن، ایران کے نظامِ جمال نے سب کو متاثر کیا، ہر شعبے میں ایک آزاد فضا میں اپنے منفرد تشخص کا احساس بخشا۔وسط ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کا کلچر اس نظامِ جمال سے شدت کے ساتھ متاثر ہوا ہے۔

برصغیر ہندو پاک میں جمالیات کا مطالعہ ایران کے نظامِ جمال کی عطا کی ہوئی روایات واقدار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔جس طرح قدیم ہندوستان میں تجربوں کی آمیزشوں کے بعد اور مختلف قوموں اور نسلوں کی آویزشوں کے بعد ملک کا نظامِ جمال متاثر ہوا اسی طرح برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کے آنے کے بعد ایران، وسط ایشیا، عراق، ترکی عرب وغیرہ کی جمالیاتی روایات واقدار کی آمیزشیں اور آویزشیں ہوئی ہیں، دراوڑیوں، آریوں، بدھوں کی دی ہوئی جمالیاتی قدروں سے مسلمانوں کی جمالیاتی قدروں کی آمیزشیں ہوئی اور صدیوں کی تاریخ میں زندگی کی کم و بیش ہر سطح پر، ہر شعبۂ زندگی میں انگنت قدروں کی صورتیں تبدیل ہوئیں اور نئی روشن قدروں کی تشکیل ہوئی، مسلمانوں کے نظامِ جمال کے آنے کے بعد ہی دراصل برصغیر ہندو پاک کی جمالیات کی تکمیل ہوتی ہے۔ہندستانی جمالیات کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمانوں کے ساتھ آنے والے نظام اور دو بڑی تہذیبوں کی آمیزشوں کے بعد پیدا شدہ جمالیاتی قدروں کا مطالعہ نہ کیا جائے۔نویں صدی عیسوی سے فارسی شاعری کی مثالیں ملنے

لگتی ہیں، گیارہویں صدی تک آتے آتے ایران میں شاعری کی قدر و قیمت کا احساس بڑھتا ہے اور دسویں صدی میں رودکی، شاہد بلخی اور دقیقی جیسے باکمال شعراء ملتے ہیں، بارہویں صدی کے فارسی شعراء نے فطرت نگاری کی جانب توجہ دی، ابوالخیر (۱۰۴۹ء) سنائی (۱۱۳۱ء) فریدالدین عطار (۱۲۲۹ء) اور مولانا جلال الدین رومی (۱۲۷۳ء) وغیرہ جیسے نامور صوفی شعراء سامنے آئے۔

حدیق الحدیقہ (سنائی) منطق الطیر (عطار) اور مثنوی مولانا روم (رومی) اپنے عہد کی شاہکار تخلیقات ہیں صوفیانہ اور فلسفیانہ مزاج نے فن اور شعری قدروں اور تجربوں میں نئی روشنی، نئی چمک دمک پیدا کر دی۔ فارسی شاعری میں علامتی فکر و نظر اور علاقیت کی ایسی بنیاد پڑتی ہے کہ ایک تازہ زندہ متحرک روایت جنم لے لیتی ہے اور اس کا ایک طویل سفر جاری رہتا ہے۔ اس علامتی روایت نے متصوفانہ تمثال کی پیش کش سے فارسی شاعری کی جمالیات میں وسعت اور گہرائی دونوں پیدا کی، فردوسی نے شاہنامہ کی تخلیق کی تو صرف ایران میں نہیں دنیا کی تاریخ میں 'ایپک' اور اس کے حسن کے تئیں نئی بیداری پیدا ہوئی، اس میں کم و بیش ساٹھ ہزار اشعار ہیں، ایران کی کہانی پیش ہوئی ہے، فردوسی نے تیس برس محنت کی پھر یہ تخلیق دنیا کی بہترین تخلیق میں ایک تخلیق بنی ہے۔ منصور ابوالقاسم فردوسی کی یہ تخلیق نظامِ جلال و جمال کی عمدہ روایات و اقدار سے رشتہ رکھتی ہے اور خود اعلیٰ جمالیاتی روایات و اقدار کی افضل علامت اور نشان بن جاتی ہے۔ اس کی اپنی بوطیقا ہے، اس 'ایپک' نے 'مملکت ایران کی تخلیق' کی علامت بن کر صرف ادبیات کو نہیں بلکہ مختلف عہد میں کئی فنون کو بھی متاثر کیا ہے، اس کے واقعات، قصے اور کردار مختلف فنون کے فنکاروں کو عزیز اور عزیز تر رہے ہیں، وسط ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے فنون پر بھی اس کے اثرات ہوئے ہیں، تاجر، شاہنامہ کے نسخوں اور اس تخلیق کے واقعات و کردار کو مختلف ملکوں میں لے گئے، شاہنامہ کے تعلق سے ایرانی مصوروں کی تصویریں بھی فروخت ہوتی رہی ہیں، وسط ایشیا میں شاہنامہ کے واقعات بھی مقبول ہوئے اور کردار بھی۔ شام، مصر، عراق، بخارا، سمرقند، آذربائیجان، ترکستان اور ہندوستان میں رستم، سہراب، نوشیرواں، افراسیاب، ضحاک، جمشید، فریدون، ایرج، منوچہر، تور، اسکندر، دارا وغیرہ کے کردار لوک کہانیوں اور گیتوں میں بھی شامل ہوئے، ان کی تصویریں بھی بنائی گئیں اور ان کے ڈرامے بھی اسٹیج ہوئے۔ شاہنامہ فردوسی، کے بعد، خسرو نظامی نے ایک منفرد روایت قائم کی اور فارسی ادبیات کے نظامِ جمال کو مستحکم بنایا، نظامی، سعدی، نظام الملک، عمر خیام، حافظ وغیرہ نے فارسی زبان و ادب کے معیار کو انتہائی بلند مقام پر پہنچادیا۔ برصغیر ہندو پاک کے اردو کلچر نے فارسی ادب کی ان روایات کو قبول بھی کیا اور جذب بھی کیا۔ اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے پورے عمل میں فارسی ادب کا جمالیاتی معیار ہی زیادہ پیش نظر رہا، سعدی، عمر خیام، حافظ، اور جلال الدین رومی احساس اور جذبے سے قریب ہوگئے۔ رومی کا تصوف، عمر خیام کی رباعیاں اور حافظ کی غزلیں، ہندوستان کے اس کلچر کا حصہ بن گئیں کہ جو دو بڑے نظامِ زندگی اور دو بڑے نظامِ جمال کی آویزش اور آمیزش کے بعد وجود میں آیا تھا اور جو نئی تمدنی اور تہذیبی قدروں کی تشکیل کر رہا تھا، فارسی شاعری کی روایات اور خصوصاً سعدی اور حافظ کی فنی روایات اردو ادب کی امتیازی روایات بن گئیں، صدیوں ان روایات کے ایسے اثرات ہوئے کہ ان کی پہچان مختلف عوامی زبانوں کے فنکاروں کے کلام میں بھی ہونے لگی، کبیر اس کی عمدہ مثال ہیں، مولانا روم کی شاعری کا 'کینوس' بہت بڑا اور انتہائی گہرا تھا، برصغیر کے وہ شعراء کہ جن کی دلچسپی تصوف سے تھی انہوں نے اس روایت کو عزیز رکھا، اسی طرح سعدی کی نثر اور حافظ کی فنی

روایات اردو ادب کی امتیازی روایات بن گئیں، صدیوں ان روایات کے ایسے اثرات ہوئے کہ ان کی پہچان مختلف عوامی زبانوں کے فنکاروں کے کلام میں بھی ہونے لگی، کبیر اس کی عمدہ مثال ہیں۔ مولانا روم کی شاعری کا 'کینوس' بہت بڑا اور انتہائی گہرا تھا، برصغیر

کے وہ شعراء کہ جن کی دلچسپی تصوف سے تھی انہوں نے اس روایت کو عزیز رکھا، اسی طرح سعدی کی نثر اور حافظ کی غزل نے اردو کلچر کے مزاج کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ فارسی شعراء اور خصوصاً رومی اور حافظ کے کلام نے 'امیجری' یا تمثیل کی ایک نئی دنیا عطا کر دی۔ اردو کلچر یا ہندوستان کی کسی بھی زبان کے کلچر کو اتنی دولت نہیں ملی تھی، 'امیجری' یا تمثیل کی ایسی سچی سجائی کائنات نصیب نہ ہوئی تھی، سعدی، رومی، اور حافظ کے ذریعہ اردو کلچر کو فارسی تہذیب اور ایرانی تمدن کا جو نظام جمال حاصل ہوا وہ آج بھی اپنی روشنیوں کو دیکھتے اور اس کی خوشبوؤں کو پاتے رہتے ہیں۔

صرف سمرقند اور بخارا، بلخ، اور ہرات، طوس اور نیشاپور، خراسان، اور کابل میں نہیں بلکہ دلی اور لاہور، لکھنؤ اور عظیم آباد اور دکن میں بھی ایرانی جمالیاتی قدروں اور علاقائی تجربوں کی صدیوں کی آمیزشیں ہوئی ہیں۔ ایران نے جو استعارے، تشبیہیں اور پیکر عطا کئے وہ آج بھی عزیز تر ہیں، ایران کی بوطیقا نے جو نظامِ جمال دیا ہے اس میں اُس استعاراتی نظام کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ جو آج بھی اردو شاعری کا ایک مستحکم ستون بنا ہوا ہے۔ ایران کے نظامِ جمال نے صرف ادبیات کا حسن اور ادبیات کی خوبصورت جمالیاتی روایات عطا نہ کیں بلکہ فنِ تعمیر اور فنِ مصوری اور بعض دوسرے فنون کا حسن اور جوہر بھی عطا کیا۔ ہندوستانی جمالیات نے انہیں قبول کیا، کچھ اس طرح جیسے یہ جمالیاتی روایات اس کی اپنی ہوں، جیسے ان سے ہندوستانی جمالیات کی تشکیل کے امکانات روشن ہو جائیں گے، جیسے ایرانی اور ہندوستانی تجربات، اقدار اور تکنیک کی آمیزش کے بعد ہندوستانی جمالیات ایک نئی صورت اختیار کر لے گی۔

ایرانی فنِ تعمیر، فنِ مصوری اور دوسرے فنون کے ہم پر جو اثرات ہوئے ہیں ان کا مفصل مطالعہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ ضرورت ہے ان کا مطالعہ کیا جائے تاکہ ایک جانب ایران کے گہرے اثرات اور دوسری جانب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں صدیوں کی آمیزشوں کے بعد کے خوبصورت نتائج کی پہچان ہو۔

ایران میں فنونِ لطیفہ اور خصوصاً فنِ تعمیر کی جمالیات کی تاریخ بہت قدیم ہے، تہران اور مشہد کے درمیان طارق خانہ رمضان میں جو مسجد دریافت ہوئی ہے اسے ایران کی پہلی عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر ۷۵۰ء یا ۷۸۶ء میں ہوئی تھی اس کی 'ہارمونی' (Harmony) اس کا حسن ہے۔ ایران کے معماروں اور فنکاروں نے گنبدوں (Domes) کو بہت زیادہ اہمیت دی، اس کے جمال کا جلوہ وسط ایشیاء بھی پہنچا اور ہندوستان بھی۔ کہا جاتا ہے قم کی جامع مسجد کی گنبد سب سے قدیم ہے۔ تہران کے جنوب میں یہ مسجد ابو سعاد بن حسین نے ۸۷۸ء میں تعمیر کی تھی، اسی ۸۰ فٹ بلند ہے۔ ایرانی فنِ تعمیر میں، جن جمالیاتی پہلوؤں اور جہتوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے ان میں گنبد اور محراب کا ذکر ضروری ہے۔ سلجوقوں کے دور میں ساسانی روایت موجود تھی لہٰذا ایک گنبد والی عمارتیں زیادہ بنی ہیں۔ سلطان سنجر (۱۱۵۷ء) کے مقبرے پر دو گنبد ہیں۔ گنبد قابوس (مقبرہ) (۱۰۰۷ء) میں تین گنبد ہیں۔ گرگان کے بادشاہ ابوالحسن قابوس نے اس کی تعمیر کی تھی۔ اسطوانی مینار (Cylindricaltower) بنانے کی پہلی بہترین کوششوں میں ایک کوشش ہے۔ اندر خلا ہے اور اوپر گنبد ہے، خیمے کی طرح، اس کی بلندی ۱۶۷ فٹ سے کچھ زیادہ ہے، پکی اینٹوں سے بنی اس مسجد پر کوفی رسم خط میں تحریریں ہیں۔ سلجوقیوں کے عہد میں ایسی تعمیرات کی ہمیشہ اہمیت رہی ہے۔ بعض مقبروں پر چار دریچے بھی ہیں، سلجوقیوں نے مسجدوں کی تعمیر کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ لہٰذا فنِ تعمیر کا معیار بھی بلند ہوتا گیا۔ ایران نے جہاں گنبد اور محراب کو اہمیت دی وہاں ایوان اور حجرے کو بھی اہمیت دی۔ اصفہان کے شمال مشرق میں 'مسجد جامی' ہے جو

۱۳۵۰ء میں تعمیر ہوئی، ان میں ایرانیوں کا جمالیاتی شعور بخوبی جھلکتا ہے۔ ایرانیوں نے مخروطی چھت (Conical roofs) کو اہمیت دی اور غلام گردش کے ساتھ قوسی یا محراب دار چھت کا حسن بھی نمایاں کیا۔ صفوی بادشاہ شاہ عباس (۱۵۸۷ء - ۱۶۲۸ء) نے خوبصورت عمارتوں کی تعمیر کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ اصفہان میں اس کی فکر و نظر کی مثالیں موجود ہیں۔ اصفہان کی جامع مسجد اسی کی دین ہے۔ قلعے، مدرسے، مسجدیں، درویش خانے، حمام، بازار، وغیرہ ایران کے نظامِ جمال کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ایران کی تاریخ میں اور خصوصاً ایرانی جمالیات کی تاریخ میں چنگیز کی آمد ایک بہت بڑی قیامت تھی، ۱۲۲۰ء میں چنگیزی طوفان آیا، منگولوں نے عمارتیں تباہ کر دیں، تیرہویں صدی کی یہ قیامت ایسی تھی کہ کسی کو یقین نہ ہوگا کہ ایران میں ایک بار پھر زندہ ہو جائے گا اور ایک بار پھر ایران کا نظامِ جمال مرتب ہوگا۔ لیکن یہ ہوا، 'فونکس' کی طرح خود اپنی راکھ سے ایران زندہ ہوا۔ چنگیز نے نیشاپور پر قبضہ کیا اور پھر اس کے بعد پچیس برس کے اندر پورے ملک کو تباہ کر دیا، شہر جلا دیئے، عمارتوں کو خاک میں ملا دیا۔ منگولوں نے ایران پر ۱۴۳ برس حکومت کی۔ ہلاکو کہ جس نے منگول حکومت کی بنیاد قائم کی ال خاں کا خطاب اختیار کیا اور تبریز کو دارالحکومت بنایا۔ نصیر الدین طوسی کے کہنے پر ہلاکو خان نے پہلی منگول عمارت تعمیر کی۔ ہلاکو نے ایران میں عمارت سازی کے فن کو پسند کیا، فنِ تعمیر کی روایات کی تلاش کی اور تبریز کے پاس ایک شہر بنایا، سلطانیہ میں محل تعمیر کیے، دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی عمارتیں وجود میں آگئیں۔ غازان خاں نے ۱۲۹۵ء میں اسلام قبول کیا، وہ خود ایک ماہر تعمیرات تھا۔ خود نقشے بناتا اور تعمیر کرتا۔ کئی مقبرے بنوائے، ایک بہت ہی بڑا مقبرہ بنوایا کہ جس پر سونے کا استعمال غالباً پہلی بار ہوا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر میں چودہ ہزار مزدوروں نے کام کیا تھا۔ درویشوں کے لئے ایک عمارت بنوائی، باغ بنے، شہر کے بڑے دروازے بنائے گئے، اس دور میں تاج الدین علی شاہ نام کا ایک ماہر تعمیر گزرا ہے اس کی نگرانی میں بھی جانے کتنی تعمیریں ہوئیں۔ صفوی بادشاہ شاہ عباس (۱۵۸۷ء ۱۶۲۸ء) کی دلچسپی بھی تعمیرات سے گہری تھی، اصفہان میں کئی یادگار عمارتیں بنوائیں۔ وسط ایشیاء پر ایران کے گہرے اثرات ہوئے، وسط ایشیا کی عمارتیں ایران کے فن کا زبردست اثر لئے ہوئے ہیں تیمور ایران کے فنون سے بے حد متاثر ہوا اور جب واپس سمرقند گیا تو اپنے ساتھ جانے کتنے معمار، فنکار، تعمیر کے فن کے ماہرین، مصور اور صوفیوں اور شاعروں کو لے گیا، اسے عمارت سازی کا بڑا شوق تھا، ہندوستان آیا تو یہاں سے بھی فنکاروں اور معماروں کو ساتھ لے گیا تھا، وسط ایشیا میں مختلف فنون کی آمیزشوں کا ایک بڑا دور گزرا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد برصغیر ہندوپاک میں جو عمارتیں بنیں ان پر تمدنی اور فنی آمیزشوں کے حسن کے نقوش نمایاں ہیں۔ گنبد، محراب، مخروطی چھت، غلام گردش، حجرے، ایوان وغیرہ ہندوستان آئے اور ہندوستانی جمالیات میں زبردست اضافہ ہوا۔ مغل بادشاہوں نے ایرانی اور وسط ایشیائی فکر و نظر کی آبیاری میں نمایاں حصہ لیا۔ قلعوں، مقبروں، مدرسوں وغیرہ کی تعمیر میں ایرانی نظامِ جمال کی اعلیٰ اقدار کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے جو تخلیقات پیش کیں ان کے دوررس اثرات سارے ملک پر ہوئے ہیں اور فنِ تعمیر کی یہ روایات آج بھی زندہ ہیں۔

فنِ مصوری میں بھی ایران کا کارنامہ غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا علم ہے کہ ساسانی فنون نے صدیوں میں ایک پراسرار سفر کیا ہے، ایران، عراق اور شام کے فنکار ساسانی فنون سے بے حد متاثر تھے۔ اسلام کے ظہور سے قبل ایران کے آرٹ پر ساسانیوں کے گہرے اثرات پر نظر رکھی جائے تو اس ملک کے مسلمان فنکاروں کی ایک بڑی روایت کا بھی علم ہوگا۔

ساسانی اور یونانی آرٹ کی آمیزش بھی ہوئی ہے لہٰذا ایران میں اس آمیزش کی روشنی بھی اپنی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ 'عقاب' اور 'ہرن' کی ساسانی علامتیں جنت (ہوما) کی علامت، ایرانی فنکاروں نے ان علامتوں کی جانب توجہ ہی نہیں دی بلکہ اپنی جمالیاتی پیکروں کی صورتوں میں قبول کیا اور اپنے فن سے مقبولیت بخشی۔ ساسانی دور (۲۲۶ء سے ۶۳۲ء) میں ایران ایک نگار خانہ تھا، ایرانی فنون نے بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں، درباروں اور امراء کی سرپرستی میں مختلف فنون میں نئی جہتیں پیدا ہوئیں، چٹانوں کو تراش کر مجسمے بنائے گئے، مصوری اور نقاشی میں تجریدیت کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا جو روایات کی روشنی لئے ہوئے تھا۔ ایک ہی لکیر کے بار بار دہرانے کے عمل سے "کینوس" پر ایک ہی آہنگ کو ابھارنے کی کوشش ملتی ہے، (زیورات پر نقاشی کرتے ہوئے عموماً اسی تکنیک کو پسند کیا گیا ہے) ساسانیوں نے تزئین و آرائش کی ایک اعلیٰ روایت قائم کی جسے ایرانی فنکاروں نے قبول کیا اور اپنے ذوق جمال سے اس روایت کی آبیاری کی۔ بادشاہوں اور شہزادوں کی تصویروں میں لباس کی آرائش و زیبائش کا خیال رکھا گیا، بادشاہوں اور شہزادوں کو جب اپنے ذوق جمال سے تصویروں میں ابھارا تو ساسانیوں کی تکنیک کہ جس میں رنگوں کی روشنی کی بڑی اہمیت تھی قبول کی۔ ساسانی عہد کے ایرانی فنکاروں کا رشتہ ایک جانب چین سے تھا تو دوسری جانب بعض ایسے مغربی ممالک سے جو چین کے ریشم اور ریشمی کپڑوں کے خریدار تھے، ان ایرانیوں نے چین کی منڈی سے گہرا رشتہ قائم کر رکھا تھا، علم و فن کے پیش نظر یہ رشتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ چین کے علوم و فنون سے بہتر واقفیت حاصل کرنے کا یہی دور سب سے اہم ترین دور ہے، ان ہی تاجروں کے ذریعہ چینی مصنوعات اور چینی فنون دور دراز علاقوں میں زیادہ تیزی سے پہنچے ہیں۔ چینی تاجروں نے بھی اس سلسلے میں بڑا کام انجام دیا ہے۔

ہمیں اس کا علم ہے کہ ۱۲۲۰ء سے ۱۲۵۸ء تک منگولوں نے ایران پر بار بار حملے کئے اور شہروں اور دیہی علاقوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ کئی ایسے شہر جو قابل فخر تمدنی اور تہذیبی مراکز تھے جیسے اپنے تمام حسن کے ساتھ ختم ہو گئے ہوں۔ ایران کے باشندوں نے کئی بار بغاوتیں کیں لیکن ہر بار صرف اپنی تباہی کو دعوت دی۔ سب سے بڑی تباہی کتب خانوں کی ہوئی جہاں لاکھوں مخطوطات اور مسودات جل کر راکھ ہو گئے۔ ان میں بنی ہوئی خوبصورت تصویریں ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں، ۱۲۵۸ء تک ایران اور عراق پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا۔ دراصل ال خان احمد (۱۲۸۲ء - ۱۲۸۴ء) کے دور حکومت میں مختلف فنون کی ترقی ہوئی، ایران کو ایک عرصہ بعد ایک ایسا حکمران ملا تھا جسے تمدنی اور تہذیبی مظاہر سے دلچسپی تھی۔ اسی دور میں وسط ایشیا اور چین کے فنون کے اثرات پڑنے شروع ہوئے، مختلف مذاہب کے لوگ آنے لگے، مختلف افکار و خیالات کی روشنی پہنچنے لگی۔ تحفظ اور خوشحالی کے دور میں فنکاروں نے بھی فنون سے گہری دلچسپی لی۔ تبریز ایک بڑا تمدنی مرکز بن گیا جہاں غیر ملکوں کے دانشور، فنکار، محقق اور ادیب بھی آبسے۔ اب منگولوں نے شہروں میں رہنا سیکھ لیا تھا لہٰذا انہوں نے تعمیریں بھی شروع کیں۔ حکمران غازان (۱۲۹۵ء - ۱۳۰۴ء) کے عہد میں عبدالہادی نے عربی زبان کی ایک معروف تاریخ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ نیچر کی تاریخ پر یہ اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب تصور کی جاتی تھی، مصوروں نے اس کی خوبصورت تصویریں تیار کیں۔ اصل نسخہ "پائرپونٹ مورگن لائبریری نیویارک" میں محفوظ ہے اس میں ۹۴ عمدہ تصویریں ہیں جو بہت چھوٹی ہیں، بعض تصویریں ایک انچ کی ہیں اور کچھ دو انچ کی۔

تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ایران اور عراق میں منگول مصوری کا دبستان اپنی کئی جہتوں کے ساتھ نمایاں رہا ہے۔ ایرانی مصوروں نے ابتداء میں بھی چینی مصوری کو پسند کیا تھا، اب تو چینی مصوری کے عمدہ اور خوبصورت نمونے ان کے

سامنے تھے۔ چینی آرٹ کی منظر نگاری بے مثال تھی، ایرانی فنکاروں نے اس آرٹ کی منظر کشی کی حقیقت پسندی اور رومانیت دونوں کو پسند کیا۔ اس طرح وہ چینی مصوری کے اسالیب سے بھی متاثر ہوئے۔ رفتہ رفتہ چینی اور ایرانی موضوعات اور اسالیب کی آمیزش شروع ہوئی اور یہ جمالیاتی آمیزش ایرانی مصوری میں سنگِ میل بن گئی منگولوں نے چینی، چینی ترکستانی اور وسط ایشیائی جمالیاتی قدروں اور ایرانی اور عراقی آرٹ کی آمیزش میں نمایاں حصہ لیا ہے، ابتدائی منگول مسودوں میں اس آمیزش کی پہچان مشکل نہیں ہوئی، ان مسودوں اور نسخوں کی تصویروں کو بار بار پیش کیا گیا ہے۔ ایرانی مصوروں نے اس طرح بار ہا مشق کی اور اس عمل میں اس آمیزش کے حسن کا اظہار ہوتا رہا۔ غازان خان کے دور تک یہ مشق جاری رہی۔ غازان خاں کے وزیر اور مشہور تاریخ نویس رشید الدین نے منگولوں کے عہد میں بڑا کارنامہ انجام دیا، وہ خود ایک باشعور مصور تھے جنہوں نے انگنت تصویریں بنائی تھیں۔ انہوں نے یہ چاہا کہ ان کی تاریخ مختلف زبانوں میں پیش ہو اور مصور ان زبانوں کے مسودوں پر واقعات کے پیش نظر عمدہ تصویریں بنائیں۔ عربی اور فارسی میں ان کی تاریخ کی نقلیں تیار ہوئیں اور مصوروں نے تصویریں بنائیں۔ ان تصویروں میں "مرد" کے پیکر اس لئے زیادہ توجہ طلب ہیں کہ وہ منگول ہیں، ایرانی یا عراقی روایات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چینی اسالیب کی گہری چھاپ ہے۔ استنبول کے کتب خانے میں اس کے دو نسخے محفوظ ہیں۔ اسی طرح اس کا ایک نسخہ دو حصوں میں لندن کی ایشیاٹک سوسائٹی اور ایڈن برگ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ استنبول کے مسودے میں "حضرت یونس اور مچھلی" کی تصویر اس دبستان کی خصوصیات کو زیادہ بہتر طور پر ظاہر کرتی ہیں۔

منگولوں نے مصوری کے فن کی حوصلہ افزائی کی، ان کی وجہ سے ایران میں ایک نیا دبستان قائم ہو گیا، حکومتوں کی سرپرستی میں مصوروں کی تخلیقی صلاحیتیں زیادہ شدت سے ابھر آئیں، جانے کتنے مصور دربار سے وابستہ رہے اور صرف تصویریں بنانے پر معمور رہے۔ فردوسی کے شاہنامہ (۱۰۱۰ء) کو مصور کیا گیا۔ شاہنامہ، ایرانیوں کا ایک ہر دلعزیز اور انتہائی پروقار اور پر عظمت سرمایہ تھا، تاریخ اور قدیم روایات کا سر چشمہ تھا، ایرانی فنکار اس سے ذہنی اور جذباتی طور پر وابستہ تھے لہٰذا انہوں نے اسے مصور کرنے میں اپنی تمام بہتر اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال کیا، کئی کئی مصوروں نے مل کر ایک ایک تصویر تیار کی، اس کے جانے کتنے مصور نسخے اور مسودے تیار ہوئے، ۱۳۲۰ء میں تبریز کا ایک نسخہ کئی مصوروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ (دبستان شیراز میں بھی اس کے کئی مصور نسخے تیار ہوئے تھے) اس میں کم و بیش چھوٹی بڑی ۵۵ خوبصورت تصویریں ہیں، اکثر بڑی ہیں۔

پندرہویں صدی میں سلطان تیمور کے ذوقِ جمال نے ایران میں مصوری کا ایک نیا دبستان قائم کر دیا۔ ۱۳۸۶ء میں تبریز پر قبضہ ہو چکا تھا، تیمور نے ۱۴۰۱ء میں بغداد کو بھی فتح کر لیا، سمرقند اس کے عہد میں ایک بڑا تہذیبی مرکز بن گیا، تبریز اور بغداد سے وہ سینکڑوں مصوروں، معماروں اور دیگر فنکاروں کو سمرقند لے گیا۔ استنبول کے کتب خانے میں "شاہنامہ فردوسی" کا ایک مصور نسخہ (۱۳۹۳ء) اور قاہرہ میں میوزیم لائبریری میں، شاہنامہ کا ایک دوسرا نسخہ (۱۳۹۷ء) موجود ہے، ان سے اس عہد کی جمالیاتی خصوصیتوں اور فنکاروں کے جمالیاتی شعور کی پہچان ہوتی ہے۔

سلطان تیمور کے عہد میں خواجہ کرمانی (۱۲۸۱ء - ۱۳۵۰ء) کی نظموں کو مصور کیا گیا تھا۔ ۱۳۹۶ء کی ایک نقل برٹش میوزیم میں محفوظ ہے کہ جس کی ایک تصویر پر معروف مصور جنید نقاش کے دستخط ہیں، جنید نقاش، سلطان احمد (۱۳۸۲ء - ۱۴۱۰ء) کے دربار سے وابستہ تھا اور سلطانی کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ اس نقش پر سلطانی ہی کی تحریر ہے۔

تیمور کو اپنے بیٹے شاہ رخ سے بے حد محبت تھی چنانچہ اس نے اس کے آسائش کا جتنا خیال رکھا اتنا ہی فنون سے اس کی دلچسپی کو بھی پسند کیا۔ شاہ رخ نے دراصل تیمور کے زیر اثر ہی مصوری کے فن سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس نے ابتداء سے قلعے اور دربار میں مصوروں کو کام کرتے دیکھا۔ ۱۴۲۰ء میں اس نے ذاتی کتب خانے کی کتابوں، مسودوں اور نسخوں کو مصور کرنے کے لئے بہت سے مصوروں کو ملازمت دی، دنیا کا معروف مصور خلیل اسی کے دربار سے وابستہ تھا، اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ مانی کے بعد وہی سب سے بڑا مصور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ رخ کے عہد میں ہزاروں کتابوں اور نسخوں کو مصور کیا گیا۔

شاہ رخ کے لڑکے مرزا نے ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں چالیس سے زیادہ مصور کتابوں، نسخوں اور مسودوں کو منقش کرنے اور انہیں خوبصورت تصویریں عطا کرنے میں مصروف تھے۔ معروف فنکار اور مصور جعفر کی نگرانی میں ہزاروں کتابوں اور نسخوں کی خوبصورت جلد بندی کی گئی، جعفر اپنے عہد کا معروف خطاط بھی تھا اس لئے اس دور میں خطاطی کے فن نے بھی ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اس کے شاگردوں کی بڑی تعداد اس فن میں جدت پیدا کرنے کی مسلسل کامیاب کوشش کرتی رہی ہے۔ امیر شاہی اور غیاث الدین جیسے مصور بھی اس کے دربار سے وابستہ رہے جنہوں نے خراسان میں مصوری کے فن کو اعلیٰ ترین درجے پر پہنچادیا۔ غیاث الدین نے چین کا سفر بھی کیا تھا اور وہاں کی مصوری کے اعلیٰ ترین نمونوں کو بھی دیکھا تھا۔ شاہنامہ فردوسی کی نقل اور اس تخلیق کو مصور کرنے کا سلسلہ اس دور میں بھی جاری رہا، امیر شاہی اور غیاث الدین کی فکر و نظر نے ہر نسخے کو زیادہ سے زیادہ سنوارا اور سجایا، تیموری دبستان نے ایران اور عراق کی اعلیٰ ترین خصوصیتوں کو پسند کیا اور ساتھ ہی چین اور چین ترکستانی اسالیب کے حسن میں بھی اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا، اس عہد میں کلاسیکی اور رومانی دونوں فکر و نظر کام کرتی رہی ہے۔

شاہنامہ فردوسی' کے علاوہ، خمسہ نظامی، اور 'گلستاں و بوستاں' کو بھی مصور کیا گیا۔ خسرو و شیریں' لیلیٰ مجنوں، ہفت پیکر، سکندر نامہ، وغیرہ کو بھی تصویروں سے آراستہ کیا گیا اور نقاشی کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کئے گئے۔ دبستان تیموریہ (دبستان ہرات) کے اسالیب کا تغزل موضوع کی نغماتی کیفیتوں میں جذب ہے۔ رومانی موضوعات کے لئے مصوروں کے اسالیب میں اظہاریت کا حسن ملتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے موضوعات نے انہیں اسالیب کا یہ حسن بخشا ہے۔ بلاشبہ ایرانی مصوری کا ایک انتہائی سنہرا دور سلطان حسین مرزا کا ہے جس میں ایران کی بہت خوبصورت منقش اور منور مینا تور تصویریں بنیں۔ سلطان مصوری کا شیدائی تھا، اس کا وزیر میر علی شیر نوائی معروف موسیقار ، مصور اور شاعر تھا، دونوں نے مصوری کی سرپرستی کی اور فنی تخلیقات کو پروان چڑھایا۔

اس عہد میں ایرانی مصوروں نے عروج حاصل کیا، کمال الدین بہزاد اس دور کا فنکار تھا کہ جس نے اپنے ہم عصروں کو اپنی تکنیک اور رنگوں کے شعور سے بڑی شدت سے متاثر کیا اور مصوری کے اعلیٰ ترین شاہکار خلق کئے۔ اس کی فنکاری کے پیش نظر اسے مانی کا جانشین کہا گیا ہے۔ بہزاد کی تصویروں کی تکنیک اور اس کے سحر انگیز کینوس نے ایک بڑی نسل کو متاثر کیا ہے۔ اپنے کینوس پر بے جان اشیاء و عناصر میں حرکت اور زندگی پیدا کر دی ہے اعلیٰ روایات کے گہرے شعور کے ساتھ ایران کی جمالیات کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے، عجمی مصوری کے تصویر ہی سے بہزاد کا نام ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ بہزاد سے منسوب یوں تو بہت سی تصویریں ہیں لیکن بہت کم ایسی ہیں کہ جن پر اس کے دستخط ہیں۔ اس نے فطرت کے حسن سے گہری دلچسپی لی، رنگوں کے معاملے میں حد درجہ بیدار تھا۔ "گلستاں، بوستاں" اور خمسہ نظامی کی بعض تصویریں بہزاد کے تخلیقی ذہن کے بڑے کارنامے ہیں" روتھ چائلڈ کلکشن پیرس (Roth Child Collection) میں گلستان سعدی کا جو نسخہ ہے اس میں چند عمدہ تصویریں بہزاد سے

منسوب ہیں۔ "دیوانِ جامی" کو مصور کرتے ہوئے بہزاد نے درویشوں اور صوفیوں کے رقص کو پیش کیا ہے۔

سولہویں صدی میں مصوری کا صفوی دبستان قائم ہوتا ہے، اس دبستان کے فنکار بہزاد کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایرانی مصوری کے لئے تبریز ایک قابل توجہ مرکز بنتا ہے، یہاں بہزاد کی روایت موجود ہے۔ حضرت امیر خسرو کے خمسہ کی ایک نقل ۱۵۰۳ء میں بلخ میں تیار ہوئی تھی اس کی تصویریں ۱۵۱۰ء میں صفوی فنکاروں نے بنائی تھیں۔ صفوی عہد میں "دیوانِ حافظ" کو بھی مصور کیا گیا۔ اس کی پانچ تصویریں موجود ہیں۔ شیخ زادہ اس عہد کا ایک بڑا مصور تھا جو بہزاد کا شاگرد تھا۔ اسی طرح سلطان علی مشہدی بھی اس دور کا ایک ممتاز مصور تھا، اس نے اپنے بیٹے سلطان محمد نور کو اپنی نگرانی میں تربیت دے کر ایک بڑا مصور بنادیا تھا۔ سلطان محمد نور نے خمسۂ نظامی کی ایک نقل تیار کی اور اس کی خوبصورت تصویریں بنائیں۔ ہندوستان میں مغل فنکاروں نے جہاں دوسری بہت سی روایتوں سے تخلیقی رشتہ قائم کیا وہاں "خمسۂ نظامی" کی ان تصویروں کی اعلیٰ روایات کو بھی شدت سے قبول کیا ہے۔ خمسۂ نظامی اور شاہنامہ فردوسی کی تصویروں کی تخلیق کا سلسلہ مسلسل قائم رہا ہے۔ شاہ محمد، میر نقاش، مظفر علی، مرزا علی، سلطان محمد، استاد محمدی اس دور کے ممتاز مصور ہیں۔ رومانی داستانی مزاج، جنگل کے تاثرات، آبی پرندے، پراسراریت وغیرہ بنیادی خصوصیات ہیں۔ صفوی دبستان میں "شیریں فرہاد" سکندر و دارا" بہرام گور، لیلیٰ مجنوں وغیرہ مقبول موضوعات رہے ہیں، ان کے مختلف واقعات نقش کئے گئے ہیں۔ تہران کے کتب خانۂ گلستان میں جو "ظفر نامہ" (فتوحات تیمور ۹) ہے وہ ۱۵۲۹ء میں مصور کیا گیا تھا۔ صفوی مصور محمدی نے اپنی زندگی کے خوبصورت نقوش پیش کئے۔

ایران کے فنکاروں نے 'ظروف سازی' کے فن کو ایک اعلیٰ جمالیاتی سطح عطا کی، کوزوں کی آرائش و زیبائش میں انہوں نے نئی جہتیں پیدا کیں۔ چینی فن سے متاثر ہو کر فطرت نگاری کو فروغ دیا، ایرانی فنکار کنول اور روشن پودوں کی نقاشی میں اپنی مثال آپ ہیں، اس طرح پارچہ بافی (Textiles) قالین بافی، برتنوں کی تزئین کاری، بُت کاری، شیشہ گری، بلور سازی اور جلد سازی وغیرہ کے فن کو جمالیاتی سطح بخشی، اپنی مصوری کے جمال سے ہم آہنگ کیا۔

مسلمانوں کے ساتھ ایران کی یہ تمام جمالیاتی روایتیں بھی ہندوستان آئی ہیں اور اس ملک کے نظامِ جمال میں جذب ہوئی ہیں۔ ہندوستانی جمالیات، ایرانیوں کے فن تعمیر، فن مصوری، فنِ خطاطی اور دوسرے فنون سے شدت سے متاثر ہوئی ہے۔

●❖●❖●

اردو ادب میں سیکولر مشترکہ تہذیب

آزادی کے پچاس سالہ تناظر میں

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
(صدر شعبہ اردو ، مہاراشٹر کالج، ممبئی)

کسی ملک کی پہچان وہاں کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالت سے ہوتی ہے اور تہذیبیں خلاء میں جنم نہیں لیتیں، ان کی جڑیں زمین میں دور، گہرائی تک پھیلی ہوتی ہیں۔ یہ کسی ایک ہاتھ کی محنت کا نتیجہ بھی نہیں ہوتیں بلکہ ہزاروں، لاکھوں ہاتھوں کی آبیاری کا حاصل ہوتی ہیں۔ ہزاروں دلوں کی دھڑکنیں جب ایک ہی لے پر مچلتی ہیں تو زمین سے انسان کا وہ رشتہ قائم ہوتا ہے جو ازلی و ابدی ہوتا ہے، تب خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا بن جاتا ہے اور اپنا وطن خلاؤں میں پہنچ کر بھی سارے جہاں سے اچھا لگنے لگتا ہے۔ یہ پل دو پل کا قصہ نہیں، سینکڑوں برس لگ جاتے ہیں اس رشتے کو قائم ہوتے ہوتے۔ یہ رشتہ جتنا گہرا ہوگا، ادب میں اسکے نقوش اتنے ہی واضح، دیرپا اور روشن ہوں گے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب بھی ایک ایسی ہی تہذیب ہے جو سارے عالم میں کسی اور زمین کو میسر نہ آسکی۔

دراصل ہندوستان کی تاریخ، تاریخ نہیں بلکہ مختلف قوموں اور نسلوں کی آمد و رفت کا گوشوارہ ہے جس میں آمد زیادہ ہے اور رفت کم۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق بے شمار قومیں یہاں آئیں۔ نیگرائیڈ، اسٹرولائیڈ، دراوڑ، چینی، تبتی، منگول، آریہ، ایرانی، یونانی باختری، شک، کشن، ہُن، عرب، تُرک، افغان، مغل اور آخر میں فرانسیسی، ولندیزی، پرتگالی اور انگریز۔ ان ڈھیر سارے آنے والوں کے مقابلے میں ہندوستان کے اصلی باشندے مٹھی بھر ہوں گے جو ترک وطن کر کے کسی اور جگہ ہجرت کر گئے اور وہیں کے ہو گئے، ورنہ زیادہ تر تو یہی ہوا کہ جنوب میں سمٹتے چلے گئے۔ جب کہ آنے والوں کی کثیر تعداد یہیں کی ہو رہی۔ نتیجتاً مختلف قومیں یہاں بس گئیں اور ہندوستان میں کئی مذہب اور کئی زبانیں بولنے والے لوگ جمع ہو گئے اور خصوصاً مسلمانوں کی آمد کے بعد سے غیر ارادی و غیر شعوری طور پر ایک ایسا سماج تشکیل پانے لگا جو مشترکہ تہذیبی، معاشی اور معاشرتی اقدار کا حامل تھا اور کسی خاص فرقے، مذہب، نسل، زبان یا قوم کا لیبل اس پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی ہے وہ مشترکہ تہذیب جو آج بھی ہمارا قیمتی ورثہ اور ناقابل تقسیم ترکہ ہے، سیکولرزم جس کی پہچان ہے۔ اسی سیکولر مشترکہ تہذیب کا نام ہندوستانیت ہے۔ اس تہذیب کو مظاہر

قدرت کی پرستش کرنے والے، مورتی پوجا کے قائل، نرگن وادی اور اوگن وادی اور ان دیکھے خدائے واحد کے ماننے والے سبھی ہندوستانیوں نے اپنالیا۔ جس کے اثرات شاہی دربار سے بازار تک ہر شعبۂ زندگی میں یوں سرایت کر گئے کہ تمام قوموں خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کا ادبی مذاق ایک ہو گیا۔ طرز تحریر میں یکسانیت آگئی۔ فکر کی راہیں ایک ہو گئیں۔ ذکر کا انداز ایک ہو گیا۔ علمی وادبی محفلیں مشترکہ طور پر منعقد ہونے لگیں۔ رسوم ورواج میں اختلاط ہوا۔ تہواروں میں باہمی میل جول کا مظاہرہ ہوا۔ زیارت گاہیں اور عقیدت گاہیں سب کے لئے عام ہو گئیں۔ قومی ہیر وخلط ملط ہو گئے۔ غرضیکہ یہ مشترکہ تہذیب جس کے علم بردار خود بادشاہ تھے اور شاہی محلات جس کی آئینہ دار، خلوتوں سے جلوتوں تک جلوہ کناں ہو گئی۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ ادب اس سے محفوظ رہتا ۔اور وہ بھی اردو ادب!

پس جب ہم اردو ادب میں مشترکہ تہذیب، سیکولرزم اور ہندوستانیت کی بات کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی پوچھ رہا ہو کیا جسم میں روح، تصویر میں رنگ، آئینے میں عکس اور ساز میں سر ہوتا ہے؟ جو زبان بذات خود مشترکہ تہذیب کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہو اور مشترکہ تہذیب ہی کے ہاتھوں جوان ہو کر اپنے حسن کی رعنائیاں دکھا رہی ہو، اس کے پیکرِ دل آویز میں اس تہذیب کے خدوخال نہیں ہوں گے تو اور کیا ہو گا؟

اس کا ثبوت چاہئے تو اردو ادب کی تاریخ اٹھا لیجئے اور شروع سے پڑھتے چلے جائیے ۔ بسنت ایران کا موسم نہیں لیکن قلی قطب شاہ کے ہاں موجود ہے۔ دیوالی عربوں کا تہوار نہیں لیکن نظیر کے ہاں اس کی بہار دیکھ لیجئے۔ ہمالیہ عرب وایران کا پہاڑ نہیں۔ لیکن اقبال کے ہاں اس کی اونچائیوں کے فوٹوگرافس ملاحظہ کیجئے۔ گوپیوں کے ساتھ راس رچانے کی رسم عرب وایران کی نہیں، افغانستان اور ترکستان کی بھی نہیں، لیکن نواب واجد علی شاہ کے ساتھ منا کر دیکھئے تو مزہ دونا ہو جائے۔ اندر سبھا عرب وایران میں کہاں مگر امانت لکھنوی کے ساتھ یہ محفل بھی سجا لیجئے۔ یہاں تک کہ اس تہذیبی اختلاط اور سیکولر مزاج نے نعت اور مرثیہ جیسی صنف کو بھی نہ چھوڑا جس کا موضوع خالص اسلامیات تھا اور ایسے متاثر کیا کہ میر انیس جیسے مذہبی شاعر نے مرثیوں میں ہندوستانی عناصر کو جگہ دی اور نقادوں کو یہ سوچنا پڑا کہ یہ عرب ہے یا اودھ؟۔ عربی کردار ہیں یا ہندوستانی؟۔ محسن کاکوروی نے تو پوری نعت گنگا جل، کاشی، متھرا، گوکل اور گوپیوں جیسی خالص ہندوصنمیات کے استعارات میں لکھی۔ میاں دل گیر اور ترمبک راؤ ذرہ نے مرثیے اور سلام، عقیدت میں ڈوب کر کہے اور چکبست نے رامائن کا ایک سین ایسے پیش کیا جیسے مرثیے کا کوئی ٹکڑا اٹھا کر اس نظم میں رکھ دیا گیا ہو۔ غرضیکہ اردو زبان اگر ایران سے آتی تو پنڈت برج نرائن چکبست رامائن کے بجائے شیریں فرہاد کا قصہ قلمبند کرتے اور اگر وہ عرب کی دین ہوتی تو میر انیس کربلا کے تپتے میدانوں میں رسول ﷺ کے گھرانے کی صابر، پردہ دار عورتوں سے ہندوستانی بیویوں کی طرح نہ بین کرواتے نہ ہندوستانی ماؤں کی طرح یہ دعائیں دلواتے کہ۔

صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے　　　　یارب! رسولِ پاکؑ کی کھیتی ہری رہے

مختصر یہ کہ اردو کا ہر ادیب اور شاعر پہلے مشترکہ تہذیب کا علم بردار ہندوستانی ہے اور پھر ادیب وشاعر۔ اس حقیقت کی روشنی میں جب ہم اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو چاہے وہ ۱۸۵۷ء کا ادب ہو، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا زمانہ ہو، ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک ہو، ۱۹۴۷ء کی تحریک آزادی اور انقلاب ہو یا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا دور، ہر جگہ اس پر مشترکہ تہذیب اور سیکولر ہندوستانیت کی ایسی چھاپ نظر آتی ہے جس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ البتہ آزادی کے بعد اس ادب کا جائزہ لینا اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ

وہ لائن ہے جہاں سے ہندوستان کی سالمیت، اس کی اکھنڈتا زخمی ہو کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ہم فسادات اور ہجرت کا کرب جھیلتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کا اردو ادب اکھنڈ ہندوستان کا ادب ہے۔ اس وقت اگر اردو کا کوئی ادیب لاہور، کراچی یا ڈھاکہ میں بیٹھ کر بھی کچھ لکھتا تھا تو وہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے لکھتا تھا اور اس کے ادب میں سیکولر مشترکہ تہذیب کی جو جھلک ملتی تھی وہ ہندوستانیت کہلاتی تھی۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا آزادی کے بعد بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہم سوچیں تو کیا ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے آتے آتے جب ہندوستان کے پاس اپنا ایک آزاد ملک کا دستور آ چکا تھا، ہمارے ملک کو ایک نام مل چکا تھا، بھارت۔ اپنی ایک زمین تھی جو سندھ، مغربی پنجاب اور مشرقی بنگال کو منہا کر کے بنی تھی، جب ملک کی ترقی کیلئے پنج سالہ پلان بھی بنائے جا چکے تھے اور اس پر عمل کرنے کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا۔ جب ملک پنڈت نہرو کی قیادت میں سوشلزم کی طرف قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا اور سیاسی اعتبار سے ناوابستہ ممالک کے گروہ میں شامل ہو چکا تھا۔ جب تقسیم اور ہجرت کے زخم بھرنے لگے تھے۔ اب جو یہاں رہ گئے تھے اور اردو میں لکھ رہے تھے وہ تو ہندوستانی ادیب تھے ہی۔ لہٰذا ان کے قلم سے جو ادب تخلیق ہو رہا تھا اس میں تو سیکولر مشترکہ تہذیب اور ہندوستانیت تھی ہی۔ مگر وہ لوگ جو اس پار چلے گئے اور چھوڑ گئے اپنے باپ دادا کی سرزمین، کیا ان کے قلم میں یہ سب کچھ نہیں ملتا؟ یہ بات غور طلب ہے کیوں کہ ہندوستان کے سیکولر مزاج کا یہ عالم ہے کہ پاکستان سے آنے والا شرنارتھی تھی آج ہندوستان کی بہت سی ریاستوں میں راج کر رہا ہے۔ اسے کوئی شرنارتھی کہہ کر غیروں کا سا سلوک نہیں کرتا۔ لیکن یہاں سے جانے والا مہاجر، آج بھی مہاجر ہے اور گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا ہے، تو کیا اسے اپنے آباء واجداد کی محبت اور پیار کی اس دھرتی کی یاد نہیں آتی؟ کیا اس کے قلم سے محبت کی یہ بوندیں نہیں ٹپکتیں؟ یہ ایک بڑا نازک سوال ہے جو اردو ادب کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ لیکن جب ہم آزادی کے بعد کے پچاس سالہ اردو ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ چاہے بھارت میں لکھا جا رہا ہو یا پاکستان میں مشترکہ تہذیب کا رس اور ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اردو ادب سے جدا ہی کب ہوئی ہے؟ ہندوستان اردو ادب میں جیسے آزادی سے پہلے موجود تھا، آج بھی موجود ہے۔ پاکستان بھلے ہی اس ادب میں شامل ہو گیا ہو مگر اس کے ایک بڑے حصے میں آج بھی ہندوستان ہی ملے گا اور وہ بھی اپنی مشترکہ تہذیب اور سیکولر روایات کے ساتھ!!! اسی طرح جیتا جاگتا، سانس لیتا ہوا ہندوستان ۔

اردو فکشن میں بھی اور اردو شاعری میں بھی ہندوستان کی خوب صورت دھرتی، یہاں کی مٹی، یہاں کے صوبے، یہاں کی ریاستیں، یہاں کے شہر، گاؤں، موسم، تاریخی یادگاریں، پرندے، جانور، کیڑے مکوڑے، فطرت کے نظارے، پہاڑ، دریا، درخت، پھل پھول، مندر، مسجد، گردوارے، چرچ، عبادت کے طریقے، گھر آنگن، کھیت کھلیان، پنگھٹ، اوتار، سادھو سنت، جوگی، نجومی، یہاں کے شوق، مشغلے، کھیل، پیسے، سواریاں، زیور، لباس، عقیدے، اندھ وشواس، سیاست، مذہب، زبان۔ غرضیکہ ہندوستان اور اس کی سیکولر مشترکہ تہذیب کا وہ کون سا پہلو ہے جس کا تذکرہ اردو ادب میں آزادی کے بعد سے آج تک نہ ہوا ہو۔

جہاں تک فکشن کا تعلق ہے، آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں جو نام ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو آزادی سے بہت پہلے لکھتے رہے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں اور وہ بھی جنھوں نے آزادی کے بعد لکھنا شروع کیا اور ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے آتے آتے ادب میں اپنا ایک امیج بنایا اور وہ بھی جو جدیدیت کے علم بردار ہیں۔ ان سب کی تحریروں میں چاہے وہ کسی بھی گروہ سے وابستہ رہے ہوں ایک بات جو ان سب کو جوڑتی ہے وہ سیکولر مشترکہ تہذیب ہے۔

مشترکہ کلچر کا نقشہ سب سے زیادہ جن کی کہانیوں میں نمایاں دکھائی دیتا ہے وہ ہے قرۃ العین حیدر اور پاکستانی ادیب انتظار

حسین ان فن کاروں میں سے ہیں جو تقسیم سے پہلے ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کی دم توڑتی ہوئی تہذیب سے وابستہ تھے لیکن اپنی جڑوں سے کٹ جانے کے سبب زمین اور زمین کے جن رشتوں سے وہ محروم ہو گئے، اس کی تہذیبی قدروں کو وہ آج تک نہیں بھلا پائے ہیں۔ ان کا ناول 'تذکرہ' ایسی ہی کہانی کو پیش کرتا ہے جہاں ایک خاندان لاہور جاکر بھی چراغ حویلی کی ڈیوڑھی، کچے صحن اور باورچی خانے کو نہیں بھولتا۔ اس ناول کا مرکزی کردار اخلاق جب اپنی ہجری زندگی پر افسوس کرتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اپنے والد مشتاق علی کی وہ زندگی بھی یاد کرتا ہے جو ہجرت سے پہلے انہوں نے ہندوستان میں گزاری تھی ایک مشترکہ تہذیب کے سائے تلے، وہ اپنے والد کے بارے میں سوچتا ہے کہ وہ ڈیوڑھی سے بہت کم باہر نکلتے تھے مگر جب نکلتے تھے تو تہذیبی قدریں ان کا استقبال کرتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میاں جان کی زندگی میں تو ایک جماؤ تھا بس دو ایسے موقعے آتے تھے جب چراغ حویلی سے قدم نکالتے تھے۔ ایک ساون بھادوں کے دنوں میں جب نوروز منانے کی نیت سے خاندانی تام جھام کے ساتھ باغ میں جاکر ڈیرا لگاتے۔ ایک اس وقت جب انگریز کلکٹر دورے پر یہاں آن وارد ہوتا۔ کیا چم چم کرتا تانگہ تھا۔ اور کیا دم خم اس گھوڑے کے تھے۔ کبھی تو پتہ نہیں کس زمانے سے کھٹ کھڑی گرد آلود اصطبل میں کھڑی تھی اب تو اس تانگہ ہی کی بہار تھی کہ جب میاں اس میں بیٹھ کر نکلتے تو راہ چلتے لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھے ہوئے دکاندار کھڑے ہو کر سلام کرتے۔"

مشترکہ تہذیب کی ایک علامت عزاداری بھی تھی جس میں سبھی مل جل کر حصہ لیتے تھے مگر آزادی کے بعد اس میں بھی کمی آتی گئی "آخری موم بتی" میں انتظار حسین اس کرب کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں جب کہانی کا مرکزی کردار لوٹ کر اپنے آبائی وطن ہندوستان آتا ہے تو یہاں اپنی پھوپی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولیں۔

"بھیا! اب تمہارے امام باڑے میں تالا پڑے گا۔" "آخر کیوں تالا پڑے گا۔ آپ جو ہیں" "میں رانڈ دکھیا کیا کروں۔' پھوپی جان بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "مردانی مجلس بند ہو گئی، نہ کوئی انتظام کرنے والا تھا نہ کوئی مجلس میں آتا تھا اور بھیا برا ماننے کی بات نہیں۔ پاکستان والوں نے ایسا غضب کیا ہے کہ جب سے سکہ بدلا ہے کسی نے پھوٹی کوڑی جو محرموں کے لئے بھیجی ہو۔"

اس مشترکہ کلچر کی مختلف تصویریں قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں ملتی ہیں۔ "میرے بھی صنم خانے" میں اودھ کی دم توڑتی تہذیب بھی ہے اور طبقاتی کشمکش کا احساس بھی۔ "آگ کا دریا" کے تیسرے حصے میں مصنفہ نے مغلیہ زوال کے اس عہد کی تصویر کھینچی ہے جس کا تعلق لکھنؤ کے بادشاہوں اور نوابوں سے تھا۔ اودھ کے سلاطین فنون لطیفہ کے رسیا تھے۔ ان کی محفلیں ہندو اور مسلمان فنکاروں سے بھری رہتی تھیں۔ گویا لکھنؤ مشترکہ تہذیب کا ایک نمائندہ تھا۔ اس ناول کی ہیروئن چمپا احمد جو مشترکہ تہذیب کی نمائندہ ہے، دو قومی نظریے کے بعد جو فاصلہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان پیدا ہوا، اس کی طرف اس طرح کرب آمیز لہجے میں اشارہ کرتی ہے۔

"جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قومی نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیوں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیلا بھارگوا کے۔ پھر یہ ہوا کہ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں ہے کیوں کہ میں ماتھے پر سندور نہیں سے لگاتی تھی اور کیلیشور کی آرتی اتارنے کے بجائے میری ماں نماز پڑھتی ہیں۔ لہٰذا میری تہذیب دوسری ہے۔

اس کلچر کی ایک اور خوب صورت تصویر "چاندنی بیگم" میں بہرائچ کے میلے میں ملتی ہے۔ حالانکہ اس پر کچھ اعتراضات

بھی کئے گئے۔ لیکن قرۃ العین حیدر اس کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں۔

"آج ہم ہندوستان میں جس زبردست اینٹی سیکولر انقلاب سے دوچار ہیں، اس وقت ایک مخصوص ذہنی مدرسۂ فکر کی طرف سے درگاہی کلچر کی مخالفت کوئی دانش مندی نہیں۔ تعزیہ داری کی طرح درگاہوں نے اسلامی رواداری کی سیکولر روایات کو برقرار رکھا ہے اور شدید تنگ نظری کے اس موجودہ ماحول میں بھی یہ دوسرے فرقوں کے افراد کے لئے پرکشش ہیں۔"

(چاندنی بیگم کی واپسی۔ ایوان اردو۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ صفحہ ۱۴)

قرۃ العین حیدر کے ہاں اس مٹتی ہوئی تہذیب کی یادیں ہیں، ان کے خوب صورت مرقعے ہیں اور ایک افسوس ہے اسکے زوال کا۔ یہ سب زمان و مکاں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے کہ وقت کسی کو نہیں بخشتا۔ لیکن انتظار حسین کے ہاں اس تہذیب کی صرف یادیں نہیں ان کی بازیافت کی کوشش بھی ہے اور سیاست کے گندے ہاتھوں سے اس تہذیب کے بکھرنے پر افسوس ہی نہیں بلکہ ایک کرب کی سی کیفیت ہے، ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اضطراب، جسے وہ تقسیم ہند سے آج تک جھیل رہے ہیں اور ان جیسے نہ جانے کتنے پاکستانی، جو آج بھی وہاں اجنبی ہیں اور مہاجر خیال کئے جاتے ہیں۔ 'بستی' ایسا ہی ناول ہے جس میں یوپی کے اس خاندان کی کہانی ہے جس کے افراد بقول ڈاکٹر خالد اشرف جسمانی طور پر پاکستان میں بس تو گئے ہیں مگر ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ہندوستان میں رہ گیا ہے۔ اسلئے ان کے یہاں موجود معاشرے کی کوئی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو تخیل کے ذریعہ واپس لاکر حال میں نہ شامل کیا جائے۔ اسی لئے انہیں نیم کا پیڑ، ساون کے جھولے، آم کے باغات، بلبل کی صدا، متروکہ حویلیاں، ویران مندر، بوسیدہ مدرسے اور دھول بھری پگڈنڈیاں مستقل Hunt کرتی رہتی ہیں۔ (برصغیر میں اردو ناول صفحہ ۱۸۹ ڈاکٹر خالد اشرف) اسی طرح پچیس سال کے بعد اس ناول کے کردار ذاکر کی ماں کو یاد آتا ہے کہ "وہ ساری جدی نشانیاں، اپنے جہیز کا سامان اور کربلائے معلیٰ سے آیا ہوا کفن، مدینہ منورہ والی جانماز اور خاکِ شفا کی سجدہ گاہ، ایک کوٹھری میں رکھ کر تالا ڈال آئی تھیں اور اب وہ اس کوٹھری کی چابی کی متلاشی ہیں جس میں یہ سارا سامان رکھا تھا۔ تاکہ اس سامان کو کم از کم ایک بار جا کر دھوپ ہی دکھا دی جائے" (ایضاً صفحہ ۱۹۰)

مشترکہ تہذیب کا یہ رنگ محض شمالی ہند کے قصبات ہی میں دیکھنے کو نہیں ملتا، پنجاب کی گلیاں بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں جہاں نچلے متوسط طبقے یا غریب لوگ رہتے تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ مگر دلوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ ایک دوسرے کے لئے محبتیں تھیں۔ خلوص تھا۔ کرشن چندر نے اپنے ناول میں اسی سیکولر روایات کو تازہ کیا ہے۔ خاص طور پر غدار، مٹی کے صنم اور میری یادوں کے چنار انہیں جذبات کے آئینہ دار ہیں "وہاں سے یہاں آتے ہوئے وہ اس چھوڑی ہوئی گلی کو بالکل اسی طرح یاد کرتے ہیں جس طرح یہاں سے جانے والے انتظار حسین اپنے گاؤں کو یاد کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"لاہور میں لوہاری گیٹ کے اندر ایک چوک ہے۔ چوک متی۔ اس چوک متی کے اندر ہماری گلی تھی۔ یہ ایک تنگ و تاریک گلی تھی۔ پرانے گھروں میں کچھ نئے لوگ آگئے ہیں اور پرانے لوگوں نے کچھ نئی بستیاں آباد کر لی ہیں لیکن جو جہاں جہاں گیا ہے اپنی گلی ساتھ لیتا گیا ہے۔ یہ گلی جس کا آسمان تنگ ہے اور کمرے تاریک ہیں، بڑی روشن امیدوں والی گلی ہے۔ یہ میرے سپنے میں ہمیشہ آباد رہتی ہے۔ جب بھی انسانیت میں میرا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے میں اس گلی کی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگا لیتا ہوں اور پھر زندہ ہو جاتا ہوں کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ جتنے انسان ہیں وہ سب اس گلی میں رہتے ہیں۔ اور جتنے آسیب ہیں وہ اس گلی سے باہر رہتے

ہیں۔" (افسانوی ادب۔ تحقیق و تجزیہ صفحہ ۱۲۹ عظیم الشان صدیقی)

یہی وہ احساس ہے جو سلام بن رزاق سے ننگی دوپہر کا سپاہی، اور علی امام نقوی سے مباہلہ اور رضوان احمد سے مسدود راہوں کے مسافر لکھواتا ہے۔ ایک جگہ سلام کا کردار یوں گویا ہوتا ہے۔

"میں اس بدنصیب شخص کی طرح ہوں جو دوڑتے دوڑتے ہانپ گیا ہو مگر ستانے کے لئے جس درخت کے سائے تلے بیٹھا ہے اس کی ساری جڑوں کو کیڑے کاٹ چکے ہیں"

(البم ماخوذ ننگی دوپہر کا سپاہی صفحہ ۱۱)

اردو کے سیکولر مزاج کی ایک اور مثال یہ ہے کہ وہ علاقائیت سے ماوراء ہے۔ آزادی کے پچاس سالہ سفر میں اردو کہانیوں میں سارا ہندوستان سمایا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً قاضی عبدالستار کے ہاں اودھ شہر، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم کے ہاں حیدر آباد ہے۔ حیات اللہ انصاری، حسین الحق اور غیاث احمد گدی کے ہاں بہار۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں اودھ اور بنگال ۔ کرشن چندر کے ہاں کشمیر، مہاراشٹر اور گجرات۔ بلونت سنگھ اور رتن سنگھ کے ہاں پنجاب۔ عزیز احمد اور بلراج مین را کے ہاں دلی۔ سریندر پرکاش کے ہاں دلی، پنجاب اور بمبئی۔ سلام بن رزاق، انور خان، انور قمر اور علی امام نقوی کے ہاں بمبئی۔ ساجد رشید کے ہاں یوپی۔

سیکولر روایات کے پیش نظر قرۃ العین حیدر کی 'سیتا ہرن' میں اگر سندھ کی تعلیم یافتہ لڑکی سیتا میر چندانی ہے تو جیلہ ہاشمی کے "آتش رفتہ" میں سکھ کردار ملتے ہیں۔ جیلانی بانو کے ہاں حیدر آباد کے مسلمان، کرشن چندر کے ہاں مہاراشٹر کے ہندو اور کوئی پارسی، ستیش بترا کے ہاں اونچے متوسط طبقے کے ہندو، سہیل عظیم آبادی کے ہاں آدی باسی اور نچلے طبقے کے عیسائی۔

ان کہانیوں میں ہندوستان کے سیکولر مزاج کا رنگ ایک اور صورت میں بھی ملتا ہے۔ وہ ہے ہندو دیومالا اور اسلامی روایات کا علامتی استعمال مثلاً راجندر سنگھ بیدی کے ہاں ہندو دیومالا کا استعمال دروپدی، ساوتری، جنک، دلاری، شکتی، درگا، بھوانی، اومایا گوری کی علامت میں ہندوستانی عورت کے مختلف روپ کی عکاسی کرتا ہے تو حسین الحق اور علی امام نقوی کے ہاں کربلا اور اس سے متعلق روایات علامت کی شکل میں موجود ہیں۔ انتظار حسین کی کہانیوں کا علامتی ڈھانچہ ہندو دیومالا، بدھ لوک کتھاؤں، آریائی کہانیوں اور اسلامی روایات و قصص سے تیار کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی یہ سیکولر مشترکہ تہذیب صرف اردو کہانیوں ہی میں باقی نہیں ہے بلکہ آزادی کے پچاس برسوں میں اردو شاعری نے اسے مزید طاقت ور انداز میں زندہ رکھا ہے۔ جن شاعروں کے ہاں ہمیں اس تہذیب کے گہرے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں فراق، جوش، سردار جعفری، فیض، کیفی اعظمی، ساحرلدھیانوی، جاں نثار اختر، اخترالایمان، باقر مہدی، ندا فاضلی، زبیر رضوی، بانی، نریش کمار شاد، پریم وار برٹنی ، بشیر بدر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مگر ان سب کی شاعری میں اگر مشترکہ تہذیب کے عناصر کی نشاندہی کی جائے تو ایک اور مضمون درکار ہوگا۔ لہٰذا مختصراً چند مثالیں پیش ہیں۔

سردار جعفری کی نظم 'اودھ کی خاک حسین' مشترکہ تہذیب کی خوب صورت مثال ہے جس میں شاعر سرزمین اودھ کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں حسین جھیلیں، کنول کے پھولوں کی چادریں، فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے بادل، ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور، گنگا کا پاک پانی، دھان کی کھیتیاں، ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں، کسانوں کے جھونپڑوں پر ترکاریوں کی بیلیں، پرانے پیپل کی جڑ میں رکھے ہوئے پتھر کے دیوتا، برگد کی جٹائیں، کپڑوں کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہوئے بچے، آنگن میں

ڈوریوں پر سوکھتے ہوئے دھانی دوپٹے، سرخ گوٹوں والے سیاہ لہنگے۔ سب کا ذکر ملتا ہے!

کیفی اعظمی کے یہاں ہندوستانی عورت کا روپ ملتا ہے۔ سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا اور جس پر بسنتی ساری کی چھب اور سرخ سرخ چوڑیوں سے بھری کلائیاں۔ فراق کے ہاں یہ حسن جسمانی جمالیات سے بڑھ کر ہندوستان کی روحانی اور پاکیزگی کی طرف سفر کرتا ہے جس میں رادھا کی جھپک، کرشن کی برزوری، گوکل نگری، راس لیلا، سیتا بن باس، گنگا اشنان اور آرتی اور شیو کی جٹا تک شامل ہو جاتی ہے۔ جاں نثار اس تصویر میں ہندوستان کے گھر آنگن کا گہرا رنگ بھر دیتے ہیں۔

ندا فاضلی کے گیتوں اور نظموں میں دھرتی کی بوباس ہے۔ گاؤں کی زندگی کا حسن ہے، موسموں کی دل کشی ہے۔ املی کا بوٹا ہے۔ کھٹی چٹنی جیسی ماں ہے۔ تتلی کے اڑتے رنگوں میں جھولا ڈالنے والا ساون ہے۔ انگوٹھا دکھاتا ہوا مہندی کا ٹوٹا ہے۔ بشیر بدر کے ہاں یوپی کی سردیوں میں اوڑھنے والے ریشمیں لحاف اور زعفرانی پل اوور ہیں۔ پاندان اور پیچوان کی خوشبو ہے، اونچی حویلیاں ہیں۔ حقے اور چوپالیں ہیں۔ زبیر رضوی کے ہاں بھی یہ تہذیب ایک خوبصورت رنگ لئے ہوئے ہے جسے وہ علی بن متقی کے کردار کے وسیلے سے بیان کرتے ہیں اور کبھی براہ راست خود اس کی تصویر بن جاتے ہیں۔

محبت اور انسانیت کا یہ جذبہ ۱۹۹۲ء کے سانحہ بابری مسجد کے موقع پر بھی اردو شاعر کو متزلزل نہیں کر پایا۔ مشترکہ تہذیب جس نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ملایا ہے کہ ایک کو دوسرے سے چاہتے ہوئے بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مشترکہ تہذیب تاریخ کی ایک سچائی بن کر ندا فاضلی کی اس نظم میں آگئی ہے۔ جہاں انسان، انسان ہونے کے ناطے پہچانا جاتا ہے۔ ہندو یا مسلمان ہونے کی وجہ سے نہیں۔

مجھے یاد ہے
میری بستی کے سب پیڑ
پربت، ہوائیں، پرندے
مرے ساتھ روتے تھے، ہنستے تھے
میرے ہی غم میں دریا
کناروں پہ سر کو پٹکتے تھے
میری ہی خوشیوں میں پھولوں پہ شبنم کے موتی چمکتے تھے

یہ بات ان دنوں کی ہے جب اس زمیں کو
عبادت گھروں کی ضرورت نہیں تھی
مجھی میں خدا تھا

اردو ادب نے گذشتہ پچاس برسوں میں اسی خدا کو زندہ رکھنے اور زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو انسان کے اندر کہیں مر گیا ہے۔

☆☆☆

تماشائی

ڈاکٹر آدم شیخ
(ڈائریکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ)

اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہونگے کہ صنف غزل کو نئی آب و تاب اور نئی تعبیریں بخشنے والے مجروح سلطانپوری ایک پایے کے طنز و مزاح نگار بھی ہیں اور "تماشائی" کے نام سے لکھتے ہیں۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے عوامل اور حالات تھے جن کے زیر اثر 'مجروح' "تماشائی" بن گئے۔

مجروح سلطانپوری کی تقریباً تمام طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات، بمبئی کے ایک مشہور و معروف اردو روزنامے "انقلاب" میں شائع ہوئیں۔ اس رسالے کے مدیر اردو کے مشہور نقاد اور صحافی ڈاکٹر ظ انصاری تھے۔ ڈاکٹر ظ صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مجروح سے بے حد قریب تھے اور ان کے رشتہ دار بھی۔ ان دو تعلقات کی وجہ سے ڈاکٹر ظ صاحب نے مجروح سے درخواست کی کہ وہ "انقلاب" کے لئے بھی کچھ لکھتے رہیں۔ ظ صاحب دراصل اخبار "انقلاب" کو صرف سیاسی اور ثقافتی خبروں کا پلندہ بنانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ اخبار کا علمی و ادبی پہلو بھی جاندار ہو۔ مجھے یاد ہے ظ صاحب نے اپنی ادارت کے زمانے میں اردو کی اہم شخصیتوں کو "انقلاب" میں لکھنے کی دعوت دی اور اردو زبان و ادب کی اہم تحریروں کو اپنے روزنامے میں شائع کرنا شروع کیا۔ خود ظ صاحب جیسا صاحب اسلوب فنکار، جب اخبار کے لئے مضامین اور اداریہ لکھتا تو افکار کے موتی برستے اور انداز بیان کی روشنیاں پھیل جاتیں۔ یہ "انقلاب" کی خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے ابتدا ہی چند اچھے مدیر ملے جن میں رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر ظ انصاری اور خلش جعفری شامل ہیں۔ یہ تمام حضرات سیاست و صحافت اور فکر و اسلوب پر یکساں طور پر حاوی تھے۔ ان کی ادبی و علمی حیثیت بھی مسلم تھی۔ ان لوگوں نے روزنامہ "انقلاب" کو وقار و اعتبار بخشا اور بڑے بڑے سیاستداں، ادیب، شاعر، صحافی اور رضاکار اس اخبار سے وابستگی کو باعث فخر سمجھنے لگے۔

جہاں تک مجروح سلطانپوری کا تعلق ہے، ان کے لئے اخبار و رسائل کی بیساکھی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خود انہیں کا نام کسی اخبار یا رسالے کو معیار و مقبولیت بخشنے کے لئے کافی تھا۔ ظ انصاری صاحب غالباً مجروح کا سنجیدہ کلام جس میں غزلیں، نظمیں اور قطعات وغیرہ شامل ہیں، "انقلاب" میں شائع کروانا چاہتے تھے تاکہ ایک باکمال فنکار "انقلاب" سے وابستہ ہو جائے۔ لیکن مجروح کی جدت پسند طبیعت کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی فنکاری کے ایک ایسے گوشے کو نمایاں کرنا چاہا جو آج تک پردۂ خفا میں تھا، شاید انہیں اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو دنیا سے روشناس کرانے کے لئے ایک فورم کی ضرورت تھی جو انہیں "انقلاب" کی

ورت میں مل گیا اور وہ "تماشائی" بن گئے۔

مجروح سلطانپوری کی، طنز و مزاح کی دنیا میں مشق سخن بہت سے افراد کے لئے باعث حیرت ہوگی لیکن جن حضرات کو ن سے بارہا گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنی گفتگو میں طنز و مزاح کی چاشنی گھول دیتے ں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ مجروح جیسا غزل گو، یا کوئی نظم نگار، سنجیدہ تخلیق کاری کے ساتھ ساتھ یا یز کر کے طنز و مزاح کو اپنی تخلیقات کی بنیاد بنا سکتا ہے؟ دراصل طنز و مزاح کی تخلیق کے لئے ایک مخصوص مزاج اور ماحول کا دنا لازمی ہے، مصائب و آلام سے پر اس کائنات میں جہاں زندگی سکوں و اطمینان کے ایک ایک پل کے لئے ترستی ہے، یہ ندگی کا وہ بنیادی عنصر ہے جو ایک فرد کے لئے اس کائنات کا قابل رہائش بناتا ہے، تکالیف کی شدت کو کم کر کے انسان کو جینے کا وصلہ دیتا ہے، ظرافت زندگی کی ناہمواریوں سے بددل یا ہراساں ہونے کے بجائے اس پر ہمدردی سے غور کرنے کا شعور بخشتی ہے، خود پر ہنسنے کی صلاحیت تو ہر انسان میں فطری طور پر موجود رہتی ہے لیکن بعض افراد کے مزاج میں یہ عنصر نمایاں ہوتا اور بعض کے ہاں نا قابل شناخت، ایک ظرافت نگار فنکار، زندگی کے نشیب و فراز اور ناہمواریوں کا اظہار کر کے اسے ایک فن کی شکل دے دیتا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ طنز و مزاح کی تخلیق کرنے والا فنکار فطری طور پر ایک مخصوص مزاج و میلان رکھتا ہو جو بقول فرائیڈ "بے تکی باتوں میں سے بھی تک کی بات پیدا کر لیتا ہو۔" "اسی حس ظرافت سے طنز و مزاح جنم لیتا ہے۔ مجروح سلطانپوری کے یہاں وہ مزاج و میلان پایا جاتا ہے جو گرد و پیش کے مضحک واقعات و حادثات کا ظریفانہ اسلوب میں اظہار کر سکے ۔ پھر انہیں ایک ایسا ماحول بھی ملا جو طنز و مزاح کے لئے سازگار تھا۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے الفاظ میں "طنز نگار حقیقت پسند ہوتا ہے، رومانی نہیں، خوبصورتی اور حسن سے متاثر ہو کر لوگ شاعری کرنے لگتے ہیں۔ طنز نگار خوبصورتی اور حسن سے نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش کے حقائق سے متاثر ہوتا ہے اور انہیں سے وابستہ بھی رہتا ہے۔" مجروح ایک ترقی پسند غزل گو ہیں اس لئے حسن و جمال سے متاثر ہونے کے باوجود وہ معاشرے اور ماحول پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے طنز و مزاح سے مملو اشعار سے ذہانت، زندہ دلی اور خوش طبعی جھلکتی ہے۔ بعض مفکروں کی رائے یہ ہے کہ قنوطیت ایک ظرافت نگار کی قسمت ہوتی ہے لیکن مجروح کے کلام میں رجائیت نمایاں ہے کہ یہ ان کا ذہنی رجحان ہے۔ سادہ اور سلیس الفاظ میں کہے ہوئے مجروح کے اشعار، بے حد اثر انگیز ہیں اور بڑی آسانی سے اپنے اندر پوشیدہ پیغام کو قاری تک پہنچاتے ہیں۔ 'دلی کا دواخانہ' 'یا مظہر العجائب' اور "ہم جنس" جیسی تخلیقات میں مجروح کے اس فنی کمال کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ دلی کا دواخانہ میں کھوکھلی جمہوریت، گمراہ کن مساوات اور زوال پذیر مذہبی قدروں کا ہنسی ہنسی میں مجروح نے جو پوسٹ مارٹم کیا ہے، بھلانے کی چیز نہیں۔ "روتی ہنستی عید" میں ہندوستانی مسلمانوں کی پریشان حالی، بے بسی اور سیاستدانوں کی پھیلی ہوئی زہریلی فرقہ پرستی کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ ان نظموں میں مختلف قسم کی کوتاہیوں اور خامیوں کو مجروح نے شگفتہ فضا میں پیش کیا اور کہیں بھی تلخی یا ترشی کا پتہ نہیں چلتا۔ مذکورہ نظموں کے چند اشعار دیکھئے اور مجروح کی فنی مہارت کا اندازہ لگائیے۔

دلی کا دواخانہ

بولا دوا فروش کہ مشکل نہیں علاج
کچھ دن سے تو دوانہ و مجنون ہی تو ہے

پیکٹ میں کیا ہے دیکھ ، لکھے حرف کو نہ دیکھ
جمہوریت لکھا ہے پر افیون ہی تو ہے
ڈبے پہ درج نام " مساوات " ہے مگر
یہ بھی دراصل بھنگ کا معجون ہی تو ہے
بوتل پہ ہے حفاظت قومی لکھا ہوا
لیکن جو چیز شیشے میں ہے خون ہی تو ہے
پرچہ یہ ہے وظیفے کا ، اس کو بھی ساتھ لے
آخر وفا پرستی کا مضمون ہی تو ہے

یامظہر العجائب

سجدوں سے جو سجادے تیرے حرم کی رہ کو
روکیں جو تیری رہ تو ٹھکرادے مہر و مہ کو
نائب ترا وہ برحق آیا مری سمجھ میں
لیکن جو کردے ویراں تیری ہی سجدہ گہ کو
وہ بھی ترا ہی نائب ، یا مظہر العجائب
پیغمبران حق کے کل تک تھے جو صحابی
باطل سے آج حق بھی مانگیں تو ہے خرابی
تہذیب لٹ رہی ہے پھر بھی وہ یار چپ ہیں
کل تک رہا ہے جن کا کردار انقلابی
اب ہوگئے ہیں نائب یا مظہر العجائب

طنز و مزاح کے تعلق سے مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی لکھتے ہیں کہ (ظرافت میں) میں وار ذرا اوچھا پڑے یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ مزاح

ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

مجروح کے افکار میں اس رعایتی آنچ کی کسر کم ہی ملتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو ان کے طنزیہ اشعار کسی فنکار کی جھنجھلاہٹ کا عکس ہوتے، کسی باکمال طنز نگار کی تخلیق نہ ہوتے۔ طنز نگار کو سماجی اور معاشی ناہمواریاں، غلجان و ہیجان میں مبتلا کردیتی ہیں، کسی رجحان، فرد یا طبقے کے خیال و عمل کے خلاف اس کے دل میں ایک نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن اگر وہ در حقیقت طنز نگار ہے تو اسی نفرت اور بیزاری کو نازک، لطیف اور قابل قبول انداز میں پیش کرکے اپنا مقصد حاصل کرلیتا ہے ورنہ برہنہ ہجو گوئی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ترقی پسندوں کی مذہب بیزاری اور تہذیب و تمدن سے بے نیازی میں مجروح کی نظم "اے میرے ہم نوا" فن طنز و مزاح کی ایک

بصورت مثال ہے۔اس نظم کو لکھتے وقت ایک جانب تو مجروح ترقی پسند تحریک کے تعمیری رجحان کے قائل رہے ہونگے اور سری طرف اپنے ہم خیالوں کی بے اعتدالی سے قدرے برہم بھی۔اسی کیفیت کو چند اشعار میں سمونا اور اپنی بات دوسروں تک پانا، جان جوکھوں کا کام ہے۔ نظم دیکھئے

ہم نے کہا کہ آؤ کریں مل کے احتجاج
بولے تم اور ہم تو ترقی پسند ہیں
ہم نے کہا جو تم ہو وہی ہم ہیں برملا
ہاں ، اشتراکیت کے تو ہم بھی سند ہیں
صید اقلیت ہیں مگر اس کو کیا کریں
اہل وطن کے ہم بھی تو زیر کمند ہیں
یوں ہم بھی مسجدوں کے نمازی نہیں مگر
تہذیب کی نشانیاں ہم کو پسند ہیں
تہذیب ہی گئی تو رہے ہم کہاں جناب
شاید کہ دن ہمارے بھی اب چند روز ہیں
مذہب کا مسئلہ ہے تو ہم خود کریں گے حل
ہم پر حکومتوں کے عصا کیوں بلند ہیں
روشن خیال ہم ہیں کہ نادان سچ کہو
ان کے گلے لگے ہیں جو صاحب گزند ہیں
کاٹی گئی زبان ، ادب کا لہو بہا
سوچو ذرا ہمارے ہی لب ، کب سے بند ہیں
دکھ سے زمین ہلی تو ذرا ہم بھی ہل گئے
جھوٹا لہو لگا کے " شہیدوں میں مل گئے "

طنز نگاری کو مناسب ماحول وہی کیفیت عطا کرتی ہے جو ایک خوبصورت منظر، کسی تصویر کو۔ایک مخصوص ماحول کے بغیر طنز و مزاح کی تخلیق تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔ طنز نگار کے افکار کی پذیرائی، بقول ایک نقاد "ایسے سماج میں ہوتی ہے جہاں ذہنی کلچر موجود ہو اور سماج کے افراد حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر بھی رکھتے ہوں" ایک ایسے ماحول میں جہاں غربت و امارت میں آویزش ہو، مذہب و مسلک کے نام پر ظلم و ستم کا بازار گرم ہو اور کلچر کی آڑ لے کر ہر طرح کی خرمستیاں عام ہوں، طنز نگار ایک اخلاقی محتسب کا کردار انجام دیتا ہے اور اگر اس پر اظہار و بیان کی بندشیں ہوں تو یہ فن اور نکھر آتا ہے۔ مجروح روایتی غزل گویوں اور جدت پسند فنکاروں میں ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے کبھی مصلحت پسندی اور مفاد پرستی سے کام نہیں لیا،اس وقت بھی جب بڑے بڑے ترقی پسند، حکومت وقت کے سامنے گھٹنے ٹیک رہے تھے، مجروح اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے،اسی سنت منصور کی پاداش میں انھیں

ڈیڑھ دو سال، قید و بند کی صعوبتیں بھی سہنی پڑیں، فیض احمد فیض کی طرح وہ بھی آزادی کے داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر سے نالاں تھے، سرکاری سطح ہو یا معاشرتی سطح، ہر جگہ وہ ایک تکلیف دہ حقیقت سے دوچار ہوتے رہے، زبان پر چونکہ پابندی کے تالے پڑے تھے اس لئے اظہار کی کوئی سبیل ضروری تھی، یہ راہ انہیں غزل اور طنز و مزاح کی دنیا میں ملی اور وہ اپنے دل کی کیفیتوں کو شاعرانہ فنکاری سے پیش کرنے لگے۔ سچا سیکولرازم، نانک شیخ چلی کا، اے نام نہادو، اور مثنوی بحث نامہ اس سلسلے کی اہم نظمیں ہیں۔

جوناتھن سوفٹ، ایک کامیاب طنز نگار کے لئے مزاح کا استعمال کرنا ضروری قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ طنز میں اگر مزاح اور خوشدلی کے عناصر شامل نہ ہوں تو اسے ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوتی اور طنز محض اظہار نفرت بن کر رہ جاتا ہے۔ بقول سوفٹ "طنز کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ مصنف کسی اخلاقی مسئلہ پر قاری کو اپنا موید بنائے اور وہ جس کی مذمت کرتا ہے، قاری بھی اس کی مذمت کرے"۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ طنز نگار اپنی گفتگو میں حقیقت پسندی، اعتدال اور توازن سے کام لے۔ مجروح کی سرشت میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اور انہی کی بنیاد پر ان کا طنز بلند پایہ اور معیاری ہو گیا ہے۔ "ترک تعلق" مجروح کی ایک چھوٹی سی نظم ہے لیکن اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو طنز کو خوش بیانی اور لطافت سے پر کر دیتی ہیں۔ اس نظم میں اہل ایمان شعراء کی طرف سے ترقی پسندوں سے ترک تعلق کی تجویز پر لطیف طنز ہے۔

ترک تعلق

یہ ترک رسم و رہ کیسی خود اپنے ہم زبانوں سے
زباں کو بخش دے، اے کاش نادانوں کی ہمدردی
سمجھ کی سادگی نے آخر اک مذہب کے دامن سے
غریب اردو کی صد رنگ آستیں پیوند ہی کر دی
زباں ورنہ یہ سب کی ہے کہ ہے کردار میں اس کے
جہاں داری، جہاں سازی، جہاں بینی، جہاں گردی
ملے اب جو بھی اردو کو متاع اہل ایماں سے
مگر تازہ دلیلوں سے حریفوں کی دکاں بھر دی
عجب جوش جنوں ہے جب چلا قابو نہ دشمن پر
خود اپنے ہی گلے پر پھیر لی، تیغ جوانمردی

مجروح سلطانپوری کی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت بھی روشن ہو گی کہ ان کے خاص نشانے دو ہیں۔ سرکاری اداروں کی بے راہ روی اور نامناسب مذہبی تصورات کی بے جا پیروی۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں کھل کر بات کہنے پر سرکاری اور سماجی پابندیاں ہوں، وہاں طنز کی ضرورت ایسے ہی محسوس ہوتی ہے جیسی تاریکی میں روشنی کی۔ مجروح سلطانپوری کو دینی امور پر اچھی گرفت حاصل ہے، اردو کے علاوہ وہ عربی و فارسی کے بھی ماہر زباندان ہیں، ان کا ترقی پسند گروہ سے وابستہ ہونا، اس کی دلیل ہے کہ وہ عالمی اور قومی سطح پر سیاست و معاشرت کے نشیب و فراز سے کماحقہ' واقفیت رکھتے ہیں، ان تمام امور کی موجودگی نے انہیں ایک ایسا فنکار بنا دیا ہے جو روایتوں کا پاسدار، حالات حاضرہ کا نباض اور مستقبل کا مزاج داں ہے۔ مجروح کی اسی متنوع

شخصیت و مزاج نے حکومت و مذہب کی خامیوں اور کوتاہیوں پر ضربیں لگائی ہیں لیکن اس ضرب کاری میں ہمدردی، اصلاح اور تعمیر کا جذبہ موجود ہے۔ بدیہی مخالفت و مذمت اور طعن و تشنیع سے گریز اور دوستانہ فضا میں سدھار کی کوشش، مجروح کے اسلوب شعر کے بنیادی اوصاف ہیں۔ 'آزاد غزل"، بیرونی ہاتھ، شام پر حملے کی بات، ہم جنس، بنت خلیل، مثنوی قحط رزق اور جوتوں کا ہار مجروح کی ایسی نظمیں جہاں سیاست و مذہب کی کوتاہ اندیشیوں پر لطیف چوٹیں کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں نظم "تین حرف" مذہبی نقطہ نظر سے "آزاد غزل" اور نظم "مہان ہے وہ" سیاسی زاویہ فکر سے، مجروح کی فنکاری کی عمدہ نمونے ہیں۔

"تین حرف"

وہی پھر ہوا کل کہ زوجہ مری   چلی ناک میں لے کے ہلتا بلاق
بپھر کر یہ بولیں کہ ننھی کے باپ   دکھاتے ہو یوں تو بڑے طمطراق
مجھے سوتی ساڑی میں بھیجا وہاں   جہاں ایک سے ایک فیشن میں طاق
کہو کس کے منہ پر یہ جھاڑو پھری   ہزاروں میں اڑوایا میرا مذاق
کہا میں نے جی میں بہت ہو چکا   مری سیر و تفریح ہے ان پہ شاق
برابر سہی مرد و زن پھر بھی ہے   ہماری طرف چرخ نیلی رواق
چڑھا پھر وہ غصہ کہ لرزا بدن   لگے گھومنے ، صحن و دیوار و طاق
کیا ختم جھگڑا کہ جاتا تھا کیا   کہا تین حرف اور دے دی طلاق
ہو مذہب کوئی بات ہے پھر بھی تلخ
کہ زن بے نوا ، مرد چوبند وچاق

"مہان ہے وہ"

وہ جو بیٹھا ہوا ہے کرسی پر   آج کل ہم پہ مہربان ہے وہ
حبذا ، بارش کرم ان کی   ہم زمیں ہیں تو آسمان ہے وہ
آج زندہ ہو تم اسی کے طفیل   جسم تم ہو ، وطن کی جان ہے وہ
اس نے دیکھا تو کھل گئی مسجد   اس نے چاہا تو بے اذاں ہے وہ
ہائے کیا کھود کر نکالا ہے   لوگ ششدر ہیں ، کامران ہے وہ
طنز سے دیکھتے ہو کیا مجھ کو   ہاں ، کولمبس تو بے گماں ہے وہ
اتنا عالم ہے ، ذکر اردو پر   بولا ، بابر کی اک زبان ہے وہ
کام چٹکی میں ہو ارے تو کیا   اللہ دیں کا چراغ دان ہے وہ
ختم منزل بہت ہوا خاموش   آخرش میر کارواں: ہے وہ

آزاد غزل

کالک سے جہالت کی کیا شعر لکھا ظالم
یہ کہہ کے جو ملا نے پنڈت کی جبیں چومی
پنڈت نے کہا، حضرت یہ دور ہے جدت کا
اب طرز بدل ڈالیں، اقبال ہو یا رومی
آزاد ہیں ہم فیشن، آزاد غزل کا ہے
ہے قافیہ مسجد کا اب رام جنم بھومی

طنز نگاری میں اگر صرف جذبات سے کام لیا جائے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ اس میں کسی فرد، رجحان یا معاشرے کے خلاف دل آزار باتیں ہوں، اردو ادب میں طنز کے نام پر ہجو، ہزل، پھبتی، فحاشی، لعن وطعن اور گالم گلوچ ہر چیز روا سمجھی جاتی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر، ہجو گوئی کے راستے ہی سے آئے۔ بقول حکیم الدین احمد "ہجو گو بے ڈھنگے، ناقص، بدصورت مناظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے، ناانصافی، بے رحمی اور ریاکاری کی مثالیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں وہ ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے لیکن اس صنعت کارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدت میں کمی نہیں زیادتی ہوتی ہے۔" ظرافت اور ہجو گوئی کی یہ کیفیت اردو کے دورِ قدیم کی روش تھی لیکن جب معاشرہ، اقتصادی لحاظ سے ترقی کرتا گیا اور تہذیب و تمدن نکھرنے لگے تو ایک ایسی فضا پیدا ہوئی جس نے ظرافت اور اس کی بنیادی شکل طنز میں مزاح کی چاشنی ملا کر اسے نہ صرف فنی بلندیوں پر پہنچایا بلکہ خیالات میں بھی توازن اور متانت پیدا ہوئی۔ مجروح کی طنزیہ نظموں میں مزاح کی موجودگی، ان کے طنز کو خوشگوار اور دلچسپ بنا دیتی ہے، ان کے یہاں اسلوب کی ندرت اور فکری توازن نے بعض اچھی تخلیقات کو جنم دیا ہے۔ مجروح کے مشاہدے میں عدل وانصاف اور حقیقت شناسی نے ایک ایسا نقطۂ نظر پیدا کیا جو طنز و مزاح میں شائستگی اور خوش طبعی کا متقاضی تھا۔ "بنت خلیل" نظم میں خود مجروح نے مثالی طنز و مزاح کی بنیادی ضرورتیں بیان کی ہیں۔ اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ اردو کی مشہور شاعرہ رفیعہ شبنم کے کلام کا مجموعہ "موسم بھیگی راتوں کا" منظر عام پر آیا، اس کا دیباچہ عزیز قیسی صاحب کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ شاید چند لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری ہو۔ روزنامہ "انقلاب" میں مجموعہ کلام اور شاعرہ کے خلاف "خلیل خاں" کے فرضی نام سے کسی صاحب کا تبصرہ شائع ہوا۔ رفیعہ شبنم کا خیال ہے کہ یہ تبصرہ "انقلاب" کے اس وقت کے مدیر ڈاکٹر انصاری کے ایماء پر ان کے ایک حلیف نے لکھا تھا، رفیعہ شبنم نے اس تبصرے سے ہونے والی ناراضگی کا اظہار، سراج اورنگ آبادی کی زمین میں ایک غزل لکھ کر کیا۔ یہ غزل شاعرہ نے بھنڈی بازار سے باندرہ تک بس پہ سفر کرتے ہوئے مکمل کی۔ اس روز باندرہ میں مجروح کے دولتکدے پر مشہور موسیقار نوشاد صاحب کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ تھا، اس مجلس میں قتیل شفائی، یوسف ناظم، ایس ایچ بہاری، علی رضا اور کئی شعراء موجود تھے، اتفاق سے راقم الحروف بھی ڈاکٹر ظ انصاری کی معیت میں وہاں پہنچا لیکن کچھ ضروری کام ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر تک رک نہیں سکا۔ رفیعہ شبنم نے غائبانے کی روداد سناتے ہوئے کہا، کہ خورد و نوش کے بعد ایک مخصوص شعری نشست بھی ہوئی، وہیں انہوں نے :: تازہ ترین غزل سنائی جس کے مندرجۂ دو اشعار درج ذیل ہیں۔

تو اگر اسے نہ سمجھ سکا تو قصور اس میں مرا نہیں
مرا لفظ لفظ تھا آئینہ ، مری بات بات کھری رہی
میں وہ ایک بنت خلیل ہوں کہ ہزار شعلوں میں گھر کے بھی
مری کشتِ جاں میں نمی رہی، مری شاخ دل بھی ہری رہی

مجلس کے اختتام پر ظ انصاری نے انقلاب میں رفیعہ شبنم کے خلاف شائع ہونے والے تبصرے سے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اپنے علم کی قسم کھا کر یہ کہتے ہیں کہ رفیعہ کے خلاف ان کے دل میں کوئی کدورت نہیں ہے۔ اسی دوران رفیعہ شبنم کے شوہر حسن اختر نے جو خود بھی ایک شاعر ہیں، مجروح سے یہ کہا کہ "میں بھی ظ انصاری کے نام سے مضامین لکھ لکھ کر خلیل خاں کی فاختہ اڑا دونگا"۔ چند روز بعد رفیعہ شبنم کی شخصیت اور فن کے تعلق سے ایک بار پھر خلیل خاں نے ناموزوں خیالات کا اظہار کیا۔ مجروح کہ خود ایک باکمال طنز نگار ہیں، ظ انصاری کی اس حرکت پر ناراض ہوئے اور فون پر اپنی برہمی کا اظہار بھی کیا۔ اسی پس منظر میں "بنت خلیل بھی لکھی اور اسی روزنامہ انقلاب میں شائع کروائی جس میں خلیل خاں بھی اپنے فن کا کمال دکھا رہے تھے۔ نظم "بنت خلیل" کچھ اس طرح ہے۔

بنت خلیل

(ایک مشہور شاعرہ پر طنز کے جواب میں)

(۱) خلیل خاں نے جو لکھا برنگ طنز و مزاح
بجا کہ ہنسنے ہنسانے کی ہے یہ ایک سبیل

(۲) مزاح کہتے ہیں جس کو یہ ہے وہ آئینہ
بگڑ بھی سکتا ہے اس آئینے میں عکس جمیل

(۳) ہزار رکھیئے زباں صاف مثل برگ بلور
ٹپک ہی جاتا ہے خامے سے کوئی حرف علیل

(۴) کہیں پہ تیر ، کہیں سنگ ، شعبدہ یہ کیا
ورق ہے یہ کسی عیار کی نہیں زنبیل

(۵) قلم جو بہکا تو بے دست و پا ہوئے ایسے
کسی کے دل میں چبھوئی ، کسی کی ناک میں کیل

(۶) نہ بھائی عیب نگارش ہے یہ دل آزاری
وہ طرز رکھو کہ سب کے ہوں رود غم تحلیل

(۷) اٹھالیا ہے تو زخمی نہ ہو قلم کا وقار
قلم چھپے بھی تو نکلے کوئی حسیں تاویل

(۸) بنام اردوئے مظلوم ہے عزیز ہمیں
وہ کوئی شاعر پختون ہو کہ بنت خلیل

مذکورہ بالا نظم کی روشنی میں طنز و مزاح کے تعلق سے مجروح سلطانپوری کے خیالات کا جائزہ لیں تو یہ نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔

(۱) مزاح ایک ایسا آئینہ ہے جس میں عکس جمیل بگڑ بھی سکتا ہے۔

(۲) مزاح نگار کے مزاج میں اگر متانت و توازن نہ ہو تو وہ ناموزوں الفاظ کا تصرف کر کے فکر و فن کو مجروح کرتا ہے۔

(۳) طنز میں نشتریت کی شدت ہو تو وہ معیار سے گر جاتا ہے۔

(۴) طنز میں اگر طعن و تشنیع سے کام لیا جائے تو یہ فن کی خامی اور فنکار کی کوتاہی ہے۔

(۵) طنز کا استعمال کسی کی دل آزاری کے لئے نہیں ہونا چاہئے بلکہ طنز نگار کے لئے مخلص اور متوازن ذہن کا حامل ہونا ضروری ہے۔

(۶) طنز میں اگر مزاح کا عنصر شامل نہ ہو تو اسے ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔

(۷) طنز نگار کا لب و لہجہ شائستہ، سنجیدہ اور خوش گوار ہونا چاہئے۔ غصے اور برہمی کا اظہار طنز میں سطحیت پیدا کرتا ہے۔

"بنت خلیل" کے تجزیے سے طنز و مزاح کے سلسلے میں مجروح کے جو تصورات ابھرتے ہیں ظاہر ہے خود انہوں نے اپنی تخلیقات میں بھی ان امور کا لحاظ کیا ہوگا۔ اس زاویے سے جب مجروح کی نظموں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو در حقیقت یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو میں طنز نگاری کو ایک نئی جہت بخشی ہے۔ نارمن فرلانگ نے ادبی طنز کے لئے دو بنیادی شرطیں ضروری قرار دی ہیں۔ "ایک کسی مضحک یا کراہت آمیز چیز یا واقعہ پر تنقید اور دوسرے مزاح"[۱]۔ مجروح کی نظموں میں یہ امتزاج خوبصورت انداز میں موجود ہے۔ اس ضمن میں مشتاق احمد یوسفی نے بڑی دل لگتی بات کہی ہے کہ

> "ہر وہ لکھنے والا جو سماجی اور معاشی ناہمواریوں کو دیکھتے ہی دماغی بانٹنے میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے خود کو طنز نگار کہنے اور کہلانے کا سزاوار سمجھتا ہے۔ لیکن سادہ و پرکار طنز ہے بڑی جان جوکھوں کا کام۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں، اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسے پر اترا، اترا کرتب نہیں دکھاتے بلکہ
>
> رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر [۲]

طنز کی یہ سادگی اور پرکاری مجروح کی مندرجہ ذیل نظموں میں ہم بآسانی محسوس کر سکتے ہیں۔

"ڈونیشن"

وہ ہیں اک صدر کالج، عمر ہوگی کوئی چالس کی
بدلتی رہتی ہیں ہر سال جو بچوں کی تقدیریں
وہیں داخل کرانے لے گیا میں اپنی دختر کو
سند کے ساتھ تھیں کچھ اور بھی معقول تحریریں

---

۱ بحوالہ رشید احمد صدیقی از ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید ص ۱۱۷
۲ چراغ تلے۔ ص ۱٤۔ کتاب والا پبلشرس۔ سن اشاعت ۱۹۹۲ء

وہ بولیں ، داخلہ ممکن نہیں ہے بے" ڈونیشن " کے
کہا میں نے کہ یہ تو ہیں نئی رشوت کی تدبیریں
ڈھٹائی سے یہ فرمایا کہ رشوت اس کو کہتے ہیں ؟
کیا کرتے ہیں اس " چندے " سے ہم کالج کی تعمیریں
بڑی حیرت سے تکتا رہ گیا میں ، ان کے چہرے کو
بگڑتی جا رہی تھیں سب مرے ارماں کی تصویریں
انہیں تکتا رہا یونہی تو جانے کیا سمجھ بیٹھیں
کہ الٹی پڑ گئیں حسرت بھری نظروں کی تاثیریں
کہا اٹھ کر بڑے ہی بدنظر ہو تم ، نکل جاؤ
پولس لے جائے گی ورنہ تمہیں پہنا کے زنجیریں
سمجھ میں آگیا اس دن یہ قولِ شاعرِ مشرق
" نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

بیرونی ہاتھ

عزیزو ، وہ ہیں اک لیڈر ، بھلا سا نام ہے ان کا
ہمیشہ درسِ عبرت پاؤ گے ان کے بیانوں میں
مگر اس بار تو سر پیٹ لے گا درسِ عبرت بھی
کھلا عقدہ کہ وہ ہیں قاتلوں کے رازدانوں میں
لکھی اس رازداں نے بے گناہی کی سند ان کو
لگا ہے بے زبانوں کا لہو جن کے دہانوں میں
لٹکتے ان کے شانوں پر یہ ان کے ہاتھ ہی کب ہیں
کہ سارے ہاتھ بیرونی لگے ہیں ان کے شانوں میں
مبارک تم کو میرے رہبرِ عیار گفتاری
کہ ہم سادے ہمیشہ سے رہے سادہ گمانوں میں
مگر کیشِ وفا کو بے وقوفی تم سمجھ بیٹھے
یہی تو ہے کمی تم رہبری کے نکتہ دانوں میں
جو زخمی ہیں تمہارے مت انہیں کے زخم سے کھیلو
کہ مہنگا پڑ چکا ہے کھیل یہ اکثر زمانوں میں

زمانہ ہی تمہیں اپنے ورق سے جب نکالے گا
" تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں "

ہم جنس

اگر پھولن[1] نے قتل و رہزنی کی
بجٹ سے سنگھ[2] نے گردن زنی کی
پریشاں اس خبر پر تھا میں ایسے
مماثل رہبر و رہزن ہیں کیسے
کہ بولے اک ہی جیسے سخن ساز
" کند ہم جنس باہم جنس پرواز"

کہا جاتا ہے کہ ظرافت کی اساس طنز پر رکھی گئی ہے اور اس کی باقاعدہ ابتدا یونانی تمدن میں ہوئی ہے۔ یونانی، کسی مذہبی یا ملکی تقریب میں خوب رنگ رلیاں مناتے اور حسن و شباب کے نشے میں دھت ہو کر ہنسی، دل لگی، طعن و تشنیع اور سب و شتم تک پہنچ جاتے۔ طنزیات کی ابتدا اسی دریدہ دہنی، خرمستی اور بے راہ روی سے ہوئی اور پھر انسانی تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ طنزیات کی بربریت ، نشتریت اور بے راہ روی، مندمل ہونے لگی اور اس کی جگہ ادب و تہذیب کی اعلیٰ قدروں نے لے لی۔ رفتہ رفتہ طنزیات، انسان کی زندگی کی ایک ناقابل تفریق ضرورت بن گئی جس سے معاشرے میں اوہام پرستی، ظلم و جبر اور بے ایمانی پر ضرب لگانے کا کام لیا جانے لگا۔ طنز، ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کا اگر صحیح استعمال نہیں کیا گیا تو سوسائٹی اور افراد کو نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ بقول وقار عظیم "طنز، جذبات کے اظہار کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں انسان جذبات کی گہرائیوں میں ڈوب کر، اس کے سطحی محرکات سے بچتا ہوا، کسی ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی آواز میں پیمبرانہ شان پیدا ہوتی ہے ۔" اور فنکار، تخلیق کے فن سے نابلد ہو تو اس کا طنز و مزاح لاحاصل ہو جاتا ہے۔ مجروح کی چند اور نظمیں دیکھ کر پھر اس پہلو پر گفتگو کی جائے۔

شام پر حملے کی بات

عصائے موسوی سمجھے تھے ہم ریگن کے ڈنڈے کو
وہ نکلا ناقہ غازہ کی چپٹی ناک کی ہڈی
چلی جو توپ پہلے لیبیا پر ، وہ بھی وہ نکلی
اسے کیا کہتے ہیں نرسل کا سرکنڈا کہ سرکنڈی
جبھی واشنگٹن کے ریشمی مشہور جھنڈے میں
چلے ہیں باندھ کر اس بار اسرائیل کی جھنڈی

۱۔ ہندوستان کی مشہور ڈاکو عورت
۲۔ وی پی سنگھ ، وزیر مالیات جنھوں نے بے تحاشا ٹیکس بڑھا کر پہلے سے مرتے ہوئے عوام کو اور بھی مار ڈالا

مسز برطانیہ کا بھی بہت پھولا ہے غبارہ
اگرچہ فی الحقیقت یہ نہ موٹی ہیں نہ مسٹنڈی

اکیلے سے دوکیلے بھی ہوئے اور سمت بھی بدلی
ارادہ ہے کریں اب کی طبیعت شام کی ٹھنڈی

یہ ہوگا یا نہیں ہوگا مگر حیرت تو اس پر ہے
کہاں کے مصلح اعظم ہیں یہ مشہور پاکھنڈی

ہو دشمن سر پہ لیکن یہ عرب جاگا نہ جاگے گا
سرہانے پاسبانے لاکھ پھیرا کیجئے ڈنڈی

جب اس کی یہ حمیت ہے تو پھر ہم کیوں جلائیں دل
نہ وہ توپ و تفنگ اپنی ، نہ یہ پٹرول کی منڈی

میں نہیں مانتا

ایک شور انگیز نقاد شعر[1] ناصر سے کم تر ہے شعر فراق[2]
گاہے شعر ظفر[3] ، میر کا ہم مذاق
یہ لڑاتا ، ممولے کو شہباز سے
بے لگامی قلم کی اس انداز سے
باز رکھئے تو کہتے ہیں چکا کے ہاتھ — میں نہیں مانتا

مہدی جدید — فن تمہارا ، مسائل ہمارے عیاں
کچھ نئے استعاروں میں کیجئے بیاں
لوح جدت پہ جب کچھ نہ لکھ پائیں گے
بغلیں جھانکیں گے ، زچ ہو کے فرمائیں گے
شعر میں ہو بیاں ، درد انساں کی بات — میں نہیں مانتا

شعرائے شریعت[4] نان و نفقہ کہ تھا جزو ایمان کا
چلئے ایماں بچا ، ہر مسلمان کا
اور اسی دام میں یار اٹکے رہے
شیخ تک راہِ مسجد[5] سے بھٹکے رہے
میں نے ٹوکا تو بولے یہ والا صفات — میں نہیں مانتا

۱۔ پاکستانی شاعر ناصر کاظمی ۲۔ فراق گورکھپوری ۳۔ پاکستانی شاعر ظفر اقبال
۴۔ وہ شعراء جنہوں نے نان و نفقہ کے مسئلے پر ترقی پسندوں کے اختلافی بیان پر ، سارے ترقی پسندوں کا بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا۔
۵۔ بابری مسجد اور اردو زبان کے اہم ترین مسئلے کو جان بوجھ کر یا نادانی سے نظر انداز کرگئے۔

تماشائی: میں کہ جو بات حق ہے وہ کہتا بھی ہوں
ساتھیو! میں برا بن کے رہتا بھی ہوں
یوں کہ ایسے بھی ہیں کچھ ترقی پسند
جو ہیں رُسوا کُن نیک نامانِ چند
اور ایسے ترقی پسندوں کی بات میں نہیں مانتا

روتی ہنستی عید

چاند اگا ہے آنگن آنگن، عید مبارک عید مبارک
دست دعا ہےدامن دامن، عید مبارک عید مبارک
وقت سحر، "ان کا" کیا کہنا، بیٹھیں سج کے نقلی گہنا
اس پر خوش ہیں رہ گئی عزت، عید کے دن جوڑا تو پہنا
ہو اب چاہے جس کا اترن، عید مبارک، عید مبارک

دل پہ کوئی سَو بوجھ اٹھائے، کوئے عرب کی ٹھوکر کھائے
اور یہاں چپ چاپ سی کوئی دیکھتی جائے، سنتی جائے
سکھیوں کے ہنستے پیراہن، عید مبارک، عید مبارک
بھارت یہ ہیں گلیاں تیری، ایک دھماکا، رات اندھیری
لے کے سویاں لالہ جی کو، نکلی ہی تھی دختر میری
چھوٹ پڑا ہاتھوں سے برتن، عید مبارک، عید مبارک
ہم کو خبر ہے ہم ہیں سیکولر، پھر بھی نہیں کیا ہوتا اکثر
سچ پوچھو تو بہر دوگانہ، آج گئے تھے کھیل کے جی پر
خیر سے اب کے بچ گئی گردن، عید مبارک، عید مبارک
خواہاں کب تک جسم و جاں کا، ہاتھ وطن دشمن قاتل کا
نفرت کی اس گرد میں کب تک، دھندلا چہرہ مستقبل کا
اندھا ہوگیا، کل کا درپن، عید مبارک، عید مبارک
ہم ہیں بیٹے ہند کے آخر، ہم کیوں مانیں مسلم، کافر
آج تو جو ہے یار وطن کا، واجب ہم پر اس کی خاطر
جشن مناؤ، شیخ و برہمن، عید مبارک، عید مبارک

اسکول اور کالجوں میں "ڈونیشن" کے نام پر جو رشوت خوری جاری ہے اور جو معاشرے میں ایک ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے، مجروح نے بڑے لطیف انداز میں اس پر چوٹیں کی ہیں، مسئلہ کی تلخی اور ہیڈ مسٹریس کی اپنے حسن و جمال کے تعلق سے خوش فہمی کا بیان کر کے، ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ "بیرونی ہاتھ" فریب کار اور متعصب سیاستدانوں اور حکمرانوں پر ایک زبردست حملہ ہے جو اپنی عدم صلاحیت اور جانبداری کی وجہ سے نااہل ہیں لیکن ساری تباہیوں اور بربادیوں کا ذمہ دار بیرونی ہاتھوں کو بتاتے ہیں۔ "شام پر حملے کی بات" مغربی ممالک کی عرب دشمنی، عربوں کی تساہلی اور بے حمیتی کا نقشہ کھینچتی ہے۔ "میں نہیں مانتا" میں خود ساختہ ناقدوں، گمراہ جدیدیوں، نام کے ترقی پسندوں اور ناعاقبت اندیش مذہبی رہنماؤں کے نامناسب رجحانات و خیالات پر زبردست تنقید کی گئی ہے لیکن خوبصورت اسلوب اور موزوں الفاظ میں کہ بات لوگوں کے سمجھ میں آجائے اور متانت کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ "روتی ہنستی عید" اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی پریشاں حالی، بے بضاعتی اور عدم سلامتی کی دلدوز داستان ہے۔ اس نظم میں مراد آباد کے خونیں فساد کی بازگشت ملتی ہے جب کئی نمازیوں کو موت کے گھاٹ اتار اگیا تھا، مذکورہ تمام نظموں میں مجروح فرد و معاشرے کی خامیوں، فرسودہ خیالیوں اور زیادتیوں کو نشانہ بناتے ہیں لیکن مسکرا کر، مجروح کا یہ انداز محض تفریح لینے کے لئے نہیں بلکہ اصلاح طلب بھی ہے، مجروح کے طنز میں مزاح کی چاشنی ہے اور مزاح میں طنز کی نوکیلی کیفیت۔ ان کے کلام میں طنز اور مزاح کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔ یہ دونوں مجروح کے کلام میں لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے طنز و مزاح کی ضرورت اور ان کے آپسی رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "زندگی بخش سماجی ماحول کے بغیر طنز و مزاح کا وجود ممکن نہیں۔ طنز و مزاح نہ تو خلا میں پیدا ہوتے ہیں اور نہ خلا میں ان کی نشو نما ممکن ہے۔ زندگی اور زندگی کے اقدار پر طنز و مزاح کا انحصار ہوتا ہے"۔ اسی لئے بقول نیلر "مزاح زندگی کے بارے میں وہ رجحان ہے جو زندگی کی خامیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لے کر ان کو کسی ہستی اور کسی حد تک ہمدردی کے ساتھ واضح کرتا ہے"۔ بفضلِ تعالیٰ مجروح سلطانپوری کو اپنی طویل العمری کی وجہ سے ملک کا وہ دور بھی دیکھنے کو ملا جب ہندوستان کے حمیت پسند اور خوددار لوگ آزادی کی لڑائی میں مصروف تھے۔ وہ زمانہ کشمکش، ظلم و جور، بے یقینی اور غلامی کا دور تھا اور پھر پچاس سال تک وہ آزاد ہندوستان میں بھی سانسیں لیتے رہے ہیں، جہاں معاشی اور صنعتی ترقیوں نے مادی خوشحالی تو پیدا کر دی ہیں لیکن روحیں زخمی اور قدریں پامال ہو گئی ہیں۔ معاشرے کی اس سیمابی کیفیت کو بعض اوقات مجروح نے خالص مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے اس مزاح میں دانشمندی، خوش طبعی اور رجائیت کے عناصر نمایاں ہیں، اس اسلوب مزاح میں انسان اپنی کوتاہیوں پر ہنستا بھی ہے اور آنسو بھی بہاتا ہے لیکن ہر دو سے اسے لذت ملتی ہے، کوفت نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کو درج ذیل نظموں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مینڈک اور ہم

بطور تجربہ مینڈک کو ڈالیں گرم پانی میں
تو موجِ آب کی صورت، اچھل کر بھاگ نکلے گا

جو ڈالیں سرد پانی میں تو فرطِ شادمانی سے
لگائے گا کبھی غوطے، کبھی لہروں پہ پھسلے گا

اسی پانی کو کیجئے گرم اگر آہستہ آہستہ
وہ غافل، صید فطرت، پھر نہ تڑپے گا نہ اچھلے گا
سپر ڈالے ہوئے ہم بھی محیط گرم عالم میں
وہی مینڈک ہیں جو شاید کبھی کروٹ نہ بدلے گا

اسے نام نہادو! [۱]

وہ ہم ترقی پسندوں کا جشن زریں تھا
جمال اردو سے ہوتی جہاں کی رنگینی
وہاں بھی چوکے نہ موقع پرستیوں سے تم
اسے بھی کر ہی دیا نذر مصلحت بینی
نہال نصف صدی پہلے جو لگایا تھا
وہ لایا فصل تو غیروں نے کی ثمر چینی
جو اٹھ کے تم نہ چلے آئے، کیسے آتے تم
کہ خود سے اٹھ نہیں سکتا ہے شیر قالینی
قلم[۲] کا ہاتھ بنا اس کے سامنے کشکول
کہے جو مسجد و اردو کو غیر آئینی
مصنفین ترقی پسند تم کیسے
کہ تم سے پڑتی ہے طرح زوال و کج بینی
یہاں سے نکلو، یہ میداں ہے سرفروشوں کا
طریق زاغ نہیں، کاروبار شاہینی

سچا سیکولرازم

مسجد میں جب سے ہم نے سنا رام کا بھجن
پردے تعصبات کے سب چاک ہوگئے
مسجد میں رام، یہ ہوا سچا سیکولرازم
ناحق ہی لوگ سن کے جلے، خاک ہوگئے
مندر میں اب سنیں گے ہم اللہ کا بھی نام
اب اہل ہند صاحب ادراک ہوگئے

---

[۱] لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس ۱۹۸۶ء کے پس منظر میں
[۲] بابری مسجد کے حادثے کے ذمہ دار یو-پی کے چیف منسٹر ویر بہادر سنگھ سے ایک ترقی پسند نے چندہ لیا۔ ویر بہادر
[۳] گو اردو کا بھی سخت مخالف تھا

کیوں ، شیخ جی ، درست ہے یا ہم بلا سبب
خوش فہمیوں میں اتنے خطرناک ہوگئے
یہ سن کے کچھ کہا تو نہیں ، لیکن اس کے بعد
دامان و جیب شیخ کے نمناک ہوگئے

ناٹک شیخ چلی کا

میں تھا اپنے کمرے میں جاگا ہوا
نواسا مرا آیا بھاگا ہوا
یہ بولا کہ ٹی وی پہ دلی سے آج
دکھائیں گے پھر شیخ چلی کا راج
یہ بنتے ہیں راجہ کسی راج کے
مگر ننگے سر ہیں بنا تاج کے
بڑے ہی مزے کا ہے نانا یہ کھیل
لگاتے ہیں راجہ چمبیلی کا تیل
وہ چاول ہی کھاتے ہیں لیکن پلاؤ
وہ موٹا پہنتے ہیں ، ریشم کے بھاؤ
وہ پرجا سے ملتے ہیں ، اتنا تو ہے
وہ کرسی پہ جلتے ہیں ، اتنا تو ہے
تب اک روز بڑھیا کوئی بدنصیب
یہ دکھ درد روتی ہے ان کے قریب
مہاراج کو ہے چمبیلی کا تیل
یہاں تیل مٹی کا ، اس میں بھی میل
تمہیں گھی کی پوری بھی چلتی نہیں
یہاں سوکھی روٹی بھی ملتی نہیں
جو سردی پڑے ، تم اڑاتے ہو کاگ
یہاں پر نہیں تاپنے کو بھی آگ
سنا اپنے کانوں جو پرجا کا حال
ہوا سن کے راجہ کو بے حد ملال
وہ پہلے تو روئے بڑے زور سے
ہنسے بعد میں پھر اسی شور سے
جو پھولی ہوئی توند ، ہلنے لگی
تو پیشانی گالوں سے ملنے لگی
کہا میں یوں رویا کہ تو ہے دکھی
ہنسا یوں کہ کردوں گا جلدی سکھی
مگر اس نے کچھ بھی ہٹایا نہیں
غریبی ہے بڑھیا کی اب تک وہیں
ارے نانا ، وہ جو ہے راجہ کی ذات
بڑی بے وقوفی کی کرتا ہے بات
پڑھا ہے یہ میں نے کہ پرجا سے جو
کہے جھوٹ ، نادان راجہ ہے وہ
بچاری وہ بڑھیا ، تھی کتنی اداس
چلو ، چل کے دیکھیں گے ٹی وی کے پاس
جو دیکھا تو کہتی ہے اک مس پٹیل
دکھاتے تو ہم شیخ چلی کا کھیل
مگر آج " جنوانی " دیکھوگے تم
یہ سن کر تو میں ہوگیا جیسے گم
بچارے نواسے کو تکنے لگا
مگر وہ تو اک دم پھدکنے لگا

اہاہا جو یہ کھیل ولی کا ہے   مزا اس میں سب شیخ چلی کا ہے
رہا سوچتا میں بھی دیر تک
کہ دونوں میں کیا بات ہے مشترک

مثنوی بجٹ نامہ

بجٹ آیا ہے کہتے ہیں غضب کا   بھلا ہوجائے گا اس بار سب کا
وہ پہلی سی نہیں ہے لوٹ اب کی   کئی چیزوں پہ دی ہے چھوٹ اب کی
مگر ہم کیا کریں بار خدایا؟   سنا، سب کچھ، سمجھ میں کچھ نہ آیا
وہی خوراک و پوشش کی گرانی   وہی الجھن، وہی ہے زندگانی
بہت ہم پیچھے پیچھے اس کے بھاگے   گئی مہنگائی پہلے سے بھی آگے
ارے دھوتی بھی ہوتے ہوتے چھوٹی   بدن پر رہ گئی بن کر لنگوٹی
گرہ کا مال، کیا تن کو چھپائے   کہ ان داموں تو دھاگا بھی نہ آئے
کریں کس دل سے ہمت پیرہن کی   گراں گرتے سے ہے قیمت بٹن کی
ہمیشہ دال روٹی کھاتے کھاتے   ہوس تھی ایک دن سبزی پکاتے
مگر تقدیر میں سبزی کہاں کی   دکانیں کرسیاں ہیں آسماں کی
مٹر، مثل گہر، آلو ہے سونا   کہاں تک روئیے پالک کا رونا
غضب میتھی کا ملنا ہوگیا ہے   کہاں سویا، مقدر سوگیا ہے
چھوئیں کیسے وہ مولی ہو کہ بنڈا   پولس کا بید ہے گویا چقندا
خریدیں پھل، کہاں اپنا جگر ہے   جو پھل ہے شاخ طوبیٰ کا ثمر ہے
جو ان میں سے کبھی اک چیز لیجئے   تو دس چیزوں کی گردن کاٹ دیجئے
دعائیں مانگ کے مخلوق ہاری   حکومت بھی نہیں سنتی ہماری
خدا بھی ہے خدا کی سرزمیں بھی
مگر اپنا نہیں کوئی کہیں بھی

مجروح سلطانپوری کی ایسی طنزیہ نظمیں جن میں ادبی و تہذیبی موضوعات کو برتا ہے، فنی حیثیت سے بلند پایہ ہیں، انہیں پڑھ کر سید احتشام حسین کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "طنز میں فراخدلی، وسیع القلبی اور انسانی ہمدردی کے عناصر نظر آئیں تو طنز اعلیٰ ادب بنتا ہے، حالات کو بہتر بنانے کی خواہش، انسان دوستی کا جذبہ اور ذاتی غصے کو پی جانے کی طاقت کے بغیر کوئی اچھا طنز نگار نہیں بن سکتا" [1]۔ احتشام حسین کے اس مقولے کی روشنی میں مجروح کی شخصیت اور مزاج کو دیکھا جائے تو ایک عجیب و غریب حقیقت

۱۔ سالنامہ "آج کل" دہلی اگست ۱۹۴۹ء صفحہ ۳۶،۳۵

سامنے آتی ہے کہ وہ مجروح جو ذاتی زندگی میں نازک مزاج، اور تلخی کی حد تک صاف گو ہیں، ایک طنز نگار کے روپ میں آتے ہی، بردبار، دردمند اور مصلح بن جاتے ہیں۔ مجروح کے کلام میں ایک طنز نگار کا غیظ و غضب اور جذبۂ نفرت، شگفتہ اور بے لوث اسلوب اختیار کرتا ہے، ان کی چوٹیں گہری ہوتی ہیں لیکن انداز بیان میں ایک گھلاوٹ اور اپنائیت نظر آتی ہے، طنز و مزاح میں مجروح اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور خفگی و برہمی، لطافت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہیں ہوگا کہ مجروح نے اپنی مختصر سے طنزیہ و مزاحیہ کلام کے ذریعہ نظیر اکبر آبادی اور اکبر الہ آبادی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ "شعر اور شریعت" ، نسخۂ عافیت، اور ہیاہیا" مجروح کی ان چند نظموں میں سے ہیں جن میں وہ ایک تمدنی نقاد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ ان تخلیقات میں مجروح واضح، لطیف اور موثر انداز میں ادب و ثقافت کی خامیوں اور غلط فہمیوں کی خوبصورت طریقے پر نشان دہی کرتے ہیں اور یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ انہیں صحیح معنوں میں کس طرح سمجھنا اور برتنا چاہئے۔ "شعر اور شریعت" ایک ایسی نظم ہے جس میں ترقی پسند فنکاروں پر الزام کفر کی تجویز اور بہت سے شاعروں کی جانب سے اس کی تائید سے نمودار ہونے والے خطرناک مسئلے پر مجروح نے اپنے" تاثرات" بیان کئے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ دلائل اور مثالوں کے سہارے یہ واضح کیا کہ ترقی پسندی کوئی مذہبی مسلک نہیں ہے بلکہ ایک ادبی اور سماجی نقطۂ نظر ہے۔ "نسخۂ عافیت" میں تقسیم ملک کے بعد منظر عام پر آنے والی سب سے بڑی اقلیت، مسلمانوں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد اس ملک کے مسلمانوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ہی وطن میں خود کو اجنبی اور کمزور سمجھنے کا جو مضر رجحان پیدا ہوا اور اس رجحان سے جو نفسیاتی و معاشرتی کیفیت پیدا ہوئی، اس کی عکاسی، نسخۂ عافیت' میں کی گئی ہے اور در پردہ یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ انداز فکر نامناسب اور غلط ہے۔ " ہیاہیا " مجروح کی ایک ایسی تخلیق ہے جو طنز و مزاح کی اعلیٰ صفات کی حامل ہے جس میں آزاد ہندوستان میں سیاسی رہنماؤں کی خود غرضی، بے عملی اور نااہلی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ رہنما کس طرح اپنی تقریروں اور وعدوں سے عوام کا استیصال کرتے ہیں اور انہیں خوابوں کی حسین دنیا کے علاوہ کچھ نہیں دیتے، اس موضوع کو نظم " ہیاہیا " میں برتا گیا ہے۔ مذکورہ تمام نظمیں اعلیٰ طنز و مزاح کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو خود ہی اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ مذہب، نفسیات اور سیاست کی کوتاہیوں پر شاعر نے کس فنکاری اور مہارت سے وار کئے ہیں۔ یہ نظمیں ملاحظہ کیجئے۔

شعر اور شریعت

(اخبار مشرق کلکتہ (۹ر اپریل ۱۹۸۶ء) میں ترقی پسندوں پر الزام کفر کی تجویز اور بہت سے شعراء کے تائیدی دستخط دیکھ کر)

آج کل یہ ہوا چلی ہے عجیب　　ہائے اردو زبان تیرے نصیب
شاعری کے لئے ہے شرط اسلام　　مومنِ باصفا سنائے کلام
ہے وہ مسلم تو چاہے پی کے شراب　　شعر گائے ملے گا سب کو ثواب
عقل یاروں کی جب اکہری ہے　　کفر ہی پر جو بات ٹھہری ہے
عرض بے قیل و قال ہے ان سے　　ایک سیدھا سوال ہے ان سے

غیر مسلم جو ہیں کمال نژاد
ان کے بارے میں بھی ہو کچھ ارشاد

طاق پر رکھ سب شعور و تمیز
لاؤ ان کے خلاف بھی تجویز

غیر مسلم تھے سب مچاؤ غل
کرو اپنی روایتوں کا قل

تان و نقطے کا مسئلہ نہ ہوا
حرف توحید کا ترانہ ہوا

صرف دو ایک کا بیاں سن کر
ہوگیا کس قدر گراں تم پر

دو ترقی پسند اگر تھے وہاں
دو جدیدی بھی تھے شریکِ بیاں

ایک کی انجمن تک آپ خلاف
دوسرے کو ہزار خون معاف

کچھ تو دربارۂ جدیدیت
بولتے صاف تھی اگر نیت

لیکن ان سے کہاں ٹھہرتی آگ
آپ کو تو ہے صرف ان سے لاگ

انقلابی جنہوں نے کام کئے
پہنی زنجیریں ، شاعری کے لئے

ان میں کردار کے ہیں غازی بھی
ان میں حاجی بھی ہیں ، نمازی بھی [۱]

احترام ان کا آپ کیا کرتے
گالیوں سے رہے دہن بھرتے

نہ زباں کو لگام ، نے لب کو
کھینچ مارا بیک قلم سب کو

میں بھی ان میں سے ہوں مرے بھائی
کہتے ہیں سب مجھے " تماشائی "

میں نے لکھا طلاق بل پر کل ،
" مسئلہ " اپنا ہم کریں گے حل "

مسجد بابری ہو یا رومی
کیوں بنے رام کی جنم بھومی

بند ہو آج سے یہ ہٹلر ازم
اک تماشا ہے یہ سیکولرازم

ارض کشمیر پر جو خون بہا
جز تماشائی اور کس نے کہا

بام ایمان پر چڑھے ہیں وہ
دستخط ہی تلک پڑھے ہیں وہ

یا وہ جن کا ہے شاعروں میں وقار
لکھ رہے ہیں بڑے جدید اشعار

ان مسائل پہ کیوں نہیں لکھتے
لکھ نہیں سکتے ، یوں نہیں لکھتے

ذہن نے کی بہت جو لیت و لعل
مصرعے دو رکھ دئے میانِ غزل

سب کی ہو دسترس مذاق نہیں
یہ کوئی گلگلے کا طاق نہیں

ایسے مضموں پہ جو سوار ہوا
کبھی سر کا کبھی الارا ہوا

تب یہ غازی بنیں گے اس رن میں
جب توازن ہو دانش و فن میں

۱۔ باکمال و مشہور ترقی پسند شاعر اختر سعید خاں گذشتہ ۳۸ سال سے اس تحریک سے وابستہ ہیں اور تقریباً اتنے ہی برسوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کے صدر ہیں ۔)

فہم سے بھی لیا کرو کچھ کام بزم شعراء کے مومنینِ کرام
تم میں اکثر کو یہ نہیں معلوم ہے کہاں سے یہ سازش مذموم
قدِ اصلی تو ہے کہیں پیارے تم تو سائے فقط ہو بے چارے
ورنہ مسلم کوئی ، نہ کافر ہے سب یہ سی آئی اے کی خاطر ہے
دل دکھے تو کہیں نہ ہم کیسے فن سے ایمان اٹھ گیا جیسے

تھے جو عاشق ہوئے زمانہ ساز
اردوئے نیم جاں کی عمر دراز

نسخۂ عافیت

میں نے کہا عجیب وطن کا ہے کاروبار
بولیں ، کہ بس ، بہت نہ ذرا پر نکالئے

ہم بھی اقلیت کے ہیں ، صوبہ بھی غیر کا
دشمن سہی وہ ، پھر بھی نہ فقرے اچھالئے

حاکم پہ یا پولس پہ کسی واردات کا
الزام بھی ہو تو بھی نہ سر ان کے ڈالئے

چپل جو گھس گئی ہے تو کیا تم بھی گھس گئے
مانا کلرک نے کئی کاغذ دبا لیے

میں نے کہا پھر اس کا تو مطلب یہی ہوا
ان کے مُنہ بھی اپنے ہی کھاتے میں ڈالئے

بولیں یہاں پہ کس کی سیاہی کسے لگی
اس بات کی تلاش کا مت روگ پالیے

اللہ بخشے ، دادی ہماری یہ کہہ گئیں
"سر میں جوئیں کسی کی ہوں خود ہی نکالئے"

ھنیّا ھنیّا

وہ عالم تھا لیڈر کی تقریر کا کہ نقشہ تھا عدل جہانگیر کا
" جو تم پر یہ اور اک نیا ہے ستم ہیں اس کے ازالے کی کوشش میں ہم

مرا بھی یہ کہنا ہے کچھ ہو نہ ہو
کئے جاؤ کوشش مری دوستو

جہاں تک ہے اب سیم و زر کا سوال فزوں تر ہے پہلے سے ہر ایک سال
جو پوچھا کہ پھر کیوں پریشاں ہیں لوگ کہا ہم ہیں کوشش میں کٹ جائے روگ

مرا بھی یہ کہنا ہے کچھ ہو نہ ہو
کئے جاؤ کوشش مری دوستو

نہ ٹوٹا ، نہ ٹوٹے یہ وعدے کا جال کوئی دن میں اب ہونگے ، چالیس سال
ہے ان کا وہی نغمہ جاں فزا یہ دکھ ہیں عزیزو فقط چند روز

مرا بھی یہ کہنا ہے کچھ ہو نہ ہو
کئے جاؤ کوشش مری دوستو

مجروح سلطانپوری کی طنزیہ ومزاحیہ تخلیقات، ایک مخصوص نقطۂ نظر کے طفیل وجود میں ائی ہیں۔ چونکہ یہ تخلیقات ایک روزنامے میں شائع ہوا کرتی تھیں اسلئے ان میں وقتی موضوعات کو اہمیت دی گئی ہے لیکن اس زمانی ومکانی حد بندیوں کے باوجود ان موضوعات میں اتنی وسعت وکشادگی ہے کہ ان کی لطافت، کاٹ اور ہمہ گیری سے کسی بھی خطے اور زمانے میں لطف اٹھایا جاسکتا ہے، مجروح نے اپنے طنز ومزاح میں ایک ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو سادہ بھی ہے اور پرکار بھی، موزوں الفاظ، استعاروں اور تشبیہوں کے سہارے انہوں نے اپنی نظموں میں وہ سادگی پیدا کی ہے کہ قاری کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ عمدہ طنز کے تعلق سے یہ کہا گیا ہے کہ اسے "زوداثر" اور "چونکادینے والا" ہونا چاہئے ، یہ دونوں خوبیاں مجروح کی نظموں میں موجود ہیں۔
مجروح کی طنزیہ ومزاحیہ تخلیقات کا سرمایہ، ان کی غزلوں کی طرح مختصر ہی ہے لیکن فکر وفن کی کتنے ہی خوبصورت پہلو یہاں نظر آتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے کہ "عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے، لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز تر ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے" مجروح سلطانپوری کے وجود میں اندر کی یہ آگ، باہر کی آگ سے یقیناً تیز تر ہے۔

●❖●❖●

تبصرے

نقطۂ نظر

مرتبہ
پروفیسر ظہیر علی

نام کتاب - موج کوثر کا تنقیدی مطالعہ

تصنیف - ڈاکٹر محمد معظم الدین

مبصر - ڈاکٹر صاحب علی (استاد، شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی)

شیخ محمد اکرام کی تصنیف "موج کوثر" بنیادی اعتبار سے تہذیبی تاریخ کی ایک کتاب ہے۔ شیخ اکرام علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا شمار معتبر محققین و مورخین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تیرہ صدیوں پر مشتمل ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی، علمی، تہذیبی و ثقافتی تاریخ کو سلسلۂ کوثر آب کوثر، رود کوثر اور موج کوثر تصانیف میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیر نظر کتاب "موج کوثر کا تنقیدی مطالعہ" ڈاکٹر محمد معظم الدین کا ایم فل مقالہ ہے اور ڈاکٹر نادر علی خان کی نگرانی میں مکمل ہوا ہے۔ کتاب کی ابتداء میں ایم۔ فل مقالہ کے متعلق ڈاکٹر نادر علی خاں کی جو رپورٹ تھی اس سے ایک اقتباس درج ہے۔ اس کے بعد ممتاز مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے تاثرات ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود گراں قدر ہیں۔ بعد ازاں پروفیسر محمود الٰہی کا "حرف چند" ہے۔ پھر "بیاں اپنا" خود مصنف کے قلم سے ہے جو پانچ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب "موج کوثر" کے مصنف شیخ محمد اکرام کے حالات زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب اردو میں تہذیبی تاریخ نویسی کی روایت ہے۔ یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں اردو میں تاریخ نویسی کا تعارف تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے میں اردو کی مشہور تاریخوں میں تہذیبی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے جبکہ تیسرے حصے میں خالص تہذیبی تاریخوں کے تعلق سے معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرا باب موج کوثر کے تعارف کے لئے وقف ہے۔ اس باب کا احاطہ کرنے کے لئے چار ذیلی ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ پہلا سلسلۂ کوثر، دوسرا سلسلۂ کوثر کا طریقہ کار، تیسرا موج کوثر کا زمانہ اور چوتھا موج کوثر کی اشاعت۔ "تحقیقی تعارف"۔ یہ باب تحقیق کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اسے اس طور سے پیش کیا گیا ہے کہ تاریخ نویسی کے متعلق شیخ محمد اکرام کا مطمح نظر واضح ہو گیا ہے۔

"تحریکات موج کوثر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے تیسرا باب ہے۔ اس کے تحت تمام تحریکات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی مذہبی، تہذیبی، سماجی اور ادبی اعتبار سے درجہ بندی کی گئی ہے۔ مذہبی تحریکات کے ضمن میں تحریک جہاد، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جبکہ تہذیبی، سماجی اور ادبی تحریک کے زمرے میں صرف علی گڑھ تحریک کا متوازن انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے متعلق شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ "ادبی نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک کے

سارے پھل میٹھے تھے۔"

چوتھا باب موج کوثر کے اشخاص کے لئے مخصوص ہے۔اس میں مصنف نے تحریکات کو ملحوظ رکھ کر افراد کی درجہ بندی کی ہے۔مذہبی اشخاص کے تحت سید احمد رائے بریلوی، مولانا عبدالحئی، مولانا اسماعیل شہید، سر سید احمد خاں، مولوی چراغ علی، سید امیر علی، مرزا غلام احمد اور مولانا شبلی نعمانی کا ذکر ہے۔سیاسی وسماجی زمرے میں سر سید احمد خاں، محسن الملک، وقار الملک، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی جیسی شخصیات کو جگہ دی گئی ہے جبکہ ادبی لحاظ سے خواجہ الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی اور اقبال کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پانچواں باب موج کوثر کی ادبی اہمیت کے ضمن میں ہے۔یہ باب خاصا اہم ہے۔اس کے متعلق مصنف نے خود لکھا ہے کہ

"اس میں اول تو تاریخ اور ادب کے مابین رشتوں کے حوالے سے کتاب کی ادبی حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے موج کوثر کی ادبی قدر و قیمت کے تعین کے لئے اس کی زبان وبیان اور ادبی وسائل پر بالخصوص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ آخر میں کتاب کی عمومی نوعیت کے تحت اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ موج کوثر میں تحقیقی و تنقیدی عناصر کی شمولیت کے باوجود تخلیقی شان موجود ہے اور کتاب علمی قدر و قیمت کے علاوہ ادبی حیثیت رکھتی ہے۔"

ساتواں اور آخری باب خلاصہ کلام ہے اس میں اس بات کی صراحت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ موج کوثر کی تاریخی، ادبی اور علمی اہمیت واضح ہو گئی اور شیخ محمد اکرام نے جن نتائج کا استخراج کیا ہے ان کی قدر و قیمت بھی ہمارے سامنے آگئی ہے۔

زیر نظر کتاب ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور صوری و معنوی اعتبار سے اچھی ہے۔کتابت وطباعت بھی عمدہ ہے۔کتاب کی پشت پر تصویر خوب ہے، یہ مصنف کی نوجوانی کے زمانے کی ہے۔یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ممبئی اور علی گڑھ کے علاوہ تاج بک ڈپو، رانچی اور خود مصنف کے آبائی وطن امبیڈکر نگر، یوپی سے دوسو روپے میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

توقع ہے کہ یہ کتاب علمی وادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

نام کتاب - جدہ سے جدہ تک۔یعنی قیام جدہ کے خطوط

تصنیف - شیخ احمد عثمانی، بی کام۔بی اے

مبصر - ڈاکٹر زبیدہ رفیق جمانی (شعبہ اردو، برہانی کالج آف کامرس اینڈ آرٹس، ممبئی)

اردو مکتوب نگاری یعنی مکاتیبی ادب کا دامن پہلے بھی تنگ تھا لیکن فی زمانہ تو اردو میں ذوق مکتوب نگاری اور بھی ماند پڑ گیا ہے، اور بالخصوص خطوط کے مجموعے تو گویا عنقا ہو گئے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اہل اردو کی معاشی واقتصادی زبوں حالی اس کی ابتری میں اضافہ کر رہی ہے اور یوں اردو خطوط کے مجموعوں کی اشاعت اور بھی دگر گوں ہو گئی ہے، اس لئے اگر کوئی مکتوب نگار یا ناشر ایسا مجموعہ شائع کر بھی دے تو خاطر خواہ پذیرائی یا منافع حاصل کرنا تو در کنار، اس کی لاگت کی وصولی بھی جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہیں۔

ایسے پر آشوب دور میں شیخ احمد عثمانی کے مکاتیب کا مجموعہ بنام "جدہ سے جدہ تک" منظر عام پر آیا ہے جس نے اہل نظر کے لئے یقیناً ایک لمحہ فکریہ پیدا کر دیا ہے۔یہ کتاب ایک ایسی دستاویز ہے جو پچیس پچاس برس پہلے کے اہل عرب کے معاشرہ، ان کی

معاشیات، ثقافت اور اس وقت کے لوگوں کے خلوص و محبت کے تذکروں کی ایک تاریخ بن گئی ہے۔ ساتھ ہی مکتوب نگار کے مختلف موضوعات پر تاثرات، انکے اپنوں کی محبتیں، غیروں کے تعاون، ایثار و ہمدردی، نیز اس وقت کے جدہ، مکہ، مدینہ وغیرہ کے مختلف حالات و واقعات، عربی زبان، سلام کلام، عوام اور معمولات عوام بمع ان کے مشاغل، ملابس، مراسم اور وہاں کے موسم کے علاوہ مناسک حج اور روزہ نماز وغیرہ کا بھی جگہ جگہ احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ کتاب مختلف پہلوؤں سے قدیم عرب کا ایک اہم مطالعہ ہے جسے پڑھ کر روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب میں مکتوب نگار نے وہ خطوط جمع کر دئے ہیں جو انہوں نے اپنے قیام جدہ (۱۹۵۹ء تا ۱۹۸۶ء) کے دوران اپنے اہل خانہ احباب اور اعزا و اقارب کو لکھے تھے۔ لیکن کتاب کو ضخامت سے بچانے اور اپنے پہلے تجربے یا کوشش کا نتیجہ معلوم کرنے کی خاطر انہیں صرف ۱۹۶۴ء تک محدود کر دیا ہے لہذا کتاب کے مکتوبات والے حصے کے شروع میں "حصہ اول" اور آخر میں "جاری" لکھ کر کتاب کے تعارفی ضمیمے والے باب کے صفحہ ۱۹۳ پر وہ رقم طراز ہیں " ان کے نام بھی لکھے گئے ڈھیر سارے خطوط میں کوئی مکتوب بھی بوجہ مذکورہ مجموعہ کے اس حصہ میں اب تک جگہ نہ پاسکا جو میری مجموعی ستائیس سالہ سروس کے ابتدائی صرف چار پانچ سالہ مدت یعنی ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۴ء تک محدود ہے۔" اور پھر کتاب کے آخری باب بعنوان "حرف مطلب" میں یوں رقم طراز ہیں ' اس بندہ عاجز کی یہ ناچیز کتاب اگر مقبول عام ہوئی (اور مقبول خاص بھی)، تو اس کے باقی ماندہ حصوں کی اگلی اشاعتوں کے لئے موا اگرچہ کافی موجود ہے، لیکن اسکے "بین السطور" حاصل ضرب کا جواب اگر حاصل تقسیم کی نذر نہ ہو کر برابر بھی رہا (جیسا کہ استا محترم نے اپنے دیباچہ میں میرے لئے دعا فرمائی ہے)، تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس میدان میں کودنے کے لئے مجھے غالب کے اس شعر نے چنے کے درخت پر چڑھایا تھا کہ

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

چنانچہ اس کتاب کا پہلا خط ۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کا ہے اور آخری خط ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء کا۔ پہلے خط میں ہندوستان سے جد پہنچنے کے حالات قلم بند کئے ہیں تو آخری خط میں اپنے دیگر ذاتی تذکروں کے ساتھ ساتھ وہاں عیدین کی چھٹیوں کے علاوہ وہاں قیا پذیر امریکی اور یوروپین کے مقابلے میں ہندی اور پاکستانیوں کی شہری حیثیت یا مقبولیت وغیرہ کا موازنہ کیا گیا ہے جس میں لفظ ہندی بالمقابل ہندو کے مغالطہ کا دلچسپ تذکرہ شامل ہے۔

خطوط دلچسپ اور معلوماتی بھی ہیں اور جگہ جگہ قاری کو چونکاتے بھی ہیں۔ خطوط پڑھتے ہوئے لگتا ہے جیسے مکتوب نگا مخاطب سے مکالمہ کر رہا ہو، کیونکہ یہ خانگی اور نجی ہونے کے باوجود عام دلی جذبات، خیالات اور اسرار حیات کو چھوتے ہوئے کچھ صدائے عام دیتے ہیں۔ زبان اور بیان آسان اور شستہ ہیں۔ ان میں بے ساختگی اور برجستگی ہے۔ روانیٔ بیان کے ساتھ تکلمانہ اندا نگارش ہے مثلاً خط نمبر ۹ کے مکتوب الیہ کو رہ حیات کی آزمائشوں اور تغیرات زمانہ کے تعلق سے تدریسی یا تنبیہی انداز میں یوں ر طراز ہیں۔" لیکن بھائی میرے! زندگی اسی کا نام ہے کہ کوئی تجرد کا مارا مجرد ہو یا شادی کا مارا "مشدد" دونوں ہی امید پر جیتے ہیں ان خوشیوں کو پہلے ہی اڑا دینا چاہئے جو کل کلاں کو کاٹنے دوڑیں . . . زندگی میں ہمیشہ سکوت و جمود نہیں رہتا بلکہ اسی لئے دنیا کے نقشے پر خط توقیت کے ایک طرف آج ہے تو دوسری طرف کل. . زندگی شعلہ بھی اور شبنم بھی..... . . وغیرہ وغیرہ۔ علمی، لسانی اور لغوی محاسن، لاجواب تحریفات اشعار اور متاثر کن تلمیحات سے مزین ہیں۔ مثلاً خط نمبر ا میں اپنے جد

کے پہلے سفر کی کہانی کے اختتامی موڑ پر لکھتے ہیں " تو اس حاتم جدید کے سفر مزید کی داستانِ مدید کا آگے بڑھنا اس طرح وقوع پذیر ہوا کہ " یا خط نمبر ۷ میں سعودی عرب میں نماز کی سخت پابندی کے تعلق سے ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے کے بعد اسے آخری پنچ اس طرح دیتے ہیں کہ " دو چار روز بعد مذکورہ پاکستانی ریپ Rep صاحب میرے پاس کسی کام سے آئے تو بڑے مسکرا رہے تھے۔ میں سمجھ تو گیا پھر بھی یوں ہی پوچھا کہ کیوں بھئی وہ تمہارے ایڈگر کا کیا قصہ تھا تو انہوں نے فخریہ فرمایا۔ ایڈگر دبا نہیں کسی سلطاں کی فوج سے، لیکن شکست کھا گیا میری نماز سے " یا پھر فصیح اور عام بول چال کی عربی کا فرق بیان کرتے ہوئے خط نمبر ۲۰ کے مکتوب الیہ کو ایک مثال دیتے ہوئے، سمجھاتے ہیں کہ " یوں سمجھ لو کہ تمہارے پسندیدہ عربی مقولے 'اُنظر الی ما قال ولا تنظر الیٰ من قال، کا عام بول چال کی زبان میں کیا گیا پوسٹ مارٹم کچھ اس طرح ہوگا کہ ' شف ایش عال و لا تشف من غال، " وغیرہ وغیرہ۔ ان میں پر لطف شوخ نگاری بھی ہے اور نپی تلی سلیقہ مند ظرافت کے علاوہ تاریخی و جغرافیائی معلومات کی فراہمی بھی۔ چنانچہ خط نمبر ۱۷ میں مکتوب الیہ کے کراچی میں ایک واقف کار بنام غلام مولوی صاحب کو ڈھونڈ نکالنے کا تذکرہ یوں ہے کہ " ملاقات ہوئی اپنے سامنے ایک اسمارٹ قسم کے کلین شیو مولوی صاحب کو دیکھ کر دل میں کچھ دگدا سا ہوا کہ کہیں کسی غلط آدمی سے تو مڈ بھیڑ نہیں ہوئی۔ انہوں نے شاید میری الجھن بھانپ لی، لہٰذا مسکرا کر خود ہی میری خیریت پوچھنے لگے تو "

یا پھر خط نمبر ۳۰ کے شادی شدہ مکتوب الیہ کا ملازمت کے سلسلے میں بیروت ٹرانسفر کے لئے بیچلر کوارٹر قبول کرنے پر اپنے مخصوص شک و شبہے کے نیم اظہار کے بعد لکھتے ہیں " اب چھوڑو بھی ورنہ تم کہو گے کہ میں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا۔ مگر اس میں ایک قابل غور خاص نکتہ یہ ہے کہ کسی کے ہاتھ دھونے تک بھلا کوئی اس کے لئے رکا رہے گا کہ آ بھیا میرا پیچھا کر، یا موقع غنیمت جان کر بھاگ نکلے گا کہ لو اب ہاتھ دھوؤ اور ملتے رہو۔" وغیرہ وغیرہ

خطوط کے ساتھ مکتوب نگار کے شذرات بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور کتاب کے پیش لفظ بعنوان " عرض حال۔ بلکہ براحال " میں مکتوب نگار نے عنوان کی شوخی و شگفتگی کو برقرار رکھتے ہوئے تصنیف کتاب کی حقیقی کہانی بیان کی ہے " فن مکتوب نگاری " کے عنوان کے تحت ڈاکٹر فصیح احمد نے کتاب کے دیباچے کے طور پر ایک ضخیم مقالہ تحریر کیا ہے جو مواد، پیشکش، استحضار، تحقیق و تنقید کے نقطۂ نگاہ سے نہایت پسندیدگی سے دیکھا جائے گا۔ کتاب میں جگہ جگہ سعودی عرب کے مقدس مقامات کی رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں اور عربی میں عام بول چال کے لئے عربی جملوں کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ نیز چند خطوط کے عکس بھی شامل کئے گئے ہیں۔

یہ مجموعہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث ہر کس و ناکس اور بالخصوص ان ماہرین زبان اور استادان علم کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائے گا جو اسکولوں اور کالجوں کی اردو کی نصابی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور تدوین کے کار گراں میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

سفید کاغذ پر بہترین طباعت سے مزین یہ کتاب ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے سرورق بھی رنگین اور خوبصورت ہے۔ کتاب کی افادیت اور خوبصورت طباعت دیکھتے ہوئے قیمت ۱۴۰ روپے بہت کم ہے۔

یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، صدر دفتر جامعہ نگر نئی دہلی، دہلی، ممبئی اور علی گڑھ، مکتبہ اسلامی، محمد علی روڈ ممبئی اور مصنف شیخ احمد عثمانی کی رہائش گاہ A14/604 ملت نگر اندھیری (مغرب) بمبئی ۵۳ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

نام کتاب - سوئے حرم (سفرِ حج) ۱۳؍ جولائی ۱۹۸۶ء تا ۲۶؍ اگست ۱۹۸۶ء

تصنیف :- ڈاکٹر صفیہ نصیر الدین انگولوی

مبصر - نجمہ شیخ

ڈاکٹر صفیہ انگولوی کی اولین تصنیف، "سوئے حرم" یعنی سفرِ حج کی روداد جو ۱۳؍ جولائی ۱۹۸۶ء تا ۲۶؍ اگست ۱۹۸۶ء تک یعنی کل تینتالیس دنوں پر مشتمل ہے۔

یہ اولین تصنیف ڈاکٹر صاحبہ کے دل کی آواز ہے۔ جو نہایت سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ یہ ایک سفرِ حج کی روداد ہی نہیں بلکہ ایک معلوماتی دستی کتاب ہے جس کے پڑھنے پر قارئین کو وہ معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتیں مثلاً شاہراؤں کے نام، عربی الفاظ کے ترجمے وغیرہ محسوس کراتے ہیں کہ ہم بھی سفرِ حج میں شریک ہیں۔

ڈاکٹر صفیہ انگولوی علمی و تدریسی حلقوں کی ایک معروف اور مقبول ہستی اور ایک ماہر تعلیم ہیں۔ اس تصنیف میں ایک مصنف کا ہی نہیں بلکہ ایک شاعرہ کا بھی ہم سے تعارف ہوتا ہے۔ اس روداد میں ان کی دو نعتیں بھی ہیں۔

یہ روداد مختلف عنوانات کے تحت قلمبند کی گئی ہے جو نہ صرف ہر لائبریری کی زینت بڑھا سکتی ہے بلکہ آپ اسے بطور تحفہ بھی اپنے ساتھیوں کو دے سکتے ہو۔

ڈاکٹر صفیہ انگولوی کی اس تصنیف کی مقبولیت کا اندازہ ہم اس کتاب کے زیرِ طبع دوسرے ایڈیشن سے لگا سکتے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ دیگر کئی زبانوں میں یعنی مراٹھی، انگریزی اور گجراتی میں بھی ہو رہا ہے۔

بازگشت

قارئین کے خطوط

● نوائے ادب کا شمارہ اپریل ۱۹۹۸ء ملا۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ نے اس میں نئی جان ڈال دی ہے۔ یہ خبر بھی خوش کرنے والی ہے کہ آئندہ یہ سہ ماہی شائع ہوگا۔ اس کا علمی و تحقیقی معیار برقرار رہنا چاہئے۔ اس میں کمی نہ آئے۔ نوائے ادب کی اشاعت کتنی بھی مختصر رہی ہو، مگر یہ مجلہ اہل علم کے پاس اور کتاب خانوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے اور ریسرچ اسکالرز اس سے فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس کی یہ خصوصیت کم نہیں ہونی چاہئے۔ مقالہ نما بھی نوائے ادب کا مستقل فیچر ہے۔ مگر اس کا Format وہی رکھئے جو پہلے تھا یعنی دو کالموں میں اور ہر اندراج نمایاں۔ پھر سال بھر میں اس کا اشاریہ بھی شائع کرایا جائے۔ ہندوستان پاکستان میں اور بہت سے جرائد ہیں جن کے مضامین مقالہ نما میں آنے چاہئیں۔ قارئین کے خطوط صرف وہی شائع کریں جن میں کوئی علمی ادبی یا تحقیقی مسئلہ زیر بحث آیا ہو۔ اچھی کتابوں پر گہری نظر سے کئے ہوئے تبصرے بھی اس کی انفرادیت کا نشان ہوں گے۔ میں انشاء اللہ نوائے ادب کے لئے کوئی مضمون جلد بھیجوں گا۔

نثار احمد فاروقی۔ نئی دہلی

● چار دن پہلے نوجوان "نوائے ادب" ملا۔ دلی مسرت ہوئی اور احساس ہوا کہ آپ نے نئے عزائم کے ساتھ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی کرسی سنبھالی ہے۔ یقیناً آپ کے ہاتھوں میں اس ادارہ کا مستقبل روشن رہے گا۔ نوائے ادب کا مطالعہ کیا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اپنی ادارت کے پہلے شمارے ہی سے آپ نے خوشگوار اور مفید تبدیلی لانے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے چند برسوں سے میں محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ قیمتی رسالہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہونے لگا ہے۔ اس لئے کچھ مایوسی پیدا ہونے لگی تھی، لیکن اب مایوسی کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ خدا کرے آپ کے ہاتھوں یہ رسالہ ایک بار پھر سہ ماہی بن جائے۔ میرا تعلق بھی اس ادارہ سے اور نوائے ادب سے گہرا رہا ہے اس لئے آپ کی کامیابی نے مجھے کئی طرح کی خوشیاں دی ہیں۔ اس سے قبل میں نے آپ کو "بمبئی میں اردو" یعنی بمبئی نمبر نکالنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایک بار پھر لکھ رہا ہوں کہ یہ نمبر آپ ضرور نکالیں۔ اسی کے ساتھ ایک خواہش اور ہے کہ نوائے ادب کی جلد ۵۰ کو "نوائے ادب نمبر" بنادیں جس میں پچھلی انچاس جلدوں کا جائزہ پیش کیا جائے۔ ایک طرح سے یہ ایک اشاریہ ہوگا جو آئندہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔ اس سے آئندہ کام کرنے والوں کی رہنمائی بھی ہوگی۔ ہاں نوائے ادب کے تازہ شمارے میں سید شہاب الدین صاحب کے انتقال کی خبر ضرور ہونی چاہئے تھی۔ ان کا انتقال ۳۰/ مارچ ۱۹۹۸ء کو ہوا ہے اور یہ شمارہ جون میں شائع ہوا ہے۔ مجھے اس کی کمی محسوس ہوئی۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں اور انجمن کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہوں۔ انجمن سے

میری مرادا انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے۔ **(پروفیسر) عبدالقوی دسنوی ۔ بھوپال**

● "نوائے ادب" کا نیا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ جو تبدیلیاں آپ نے اس میں کی ہیں، قابل تعریف ہیں۔ کمپیوٹر سے اردو کا کام ابھی بہت تسلی بخش نہیں، الفاظ اس قدر ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے ہیں کہ بصارت وبصیرت دونوں پر گراں گزرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ نقص جلد ہی دور ہو جائے گا۔ ایک عرض یہ ہے کہ "نوائے ادب" فارسی ترکیب ہے۔ اس میں ے اضافت ہے۔ اگر اس میں ء نہ لگایا جائے تو زیادہ صحیح ہے۔ ہم فارسی کے طلباء کو یائے اضافت پر ء غیر ضروری معلوم ہوتا ہے اور از روئے قاعدہ بھی بے جا ہے۔ امید ہے کہ اس مسئلہ پر آپ غور فرمائیں گے اور ضروری کارروائی بھی۔ میں رسالے کے ظاہری اور باطنی محاسن پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ "نوائے ادب" آپ کی مدیریت میں ترقی کے مراحل طے کرتا رہے گا **پروفیسر شریف حسین قاسمی ۔ دھلی**

● بنگلور میں آپ سے ملاقات خوب رہی۔ اس دوران، میں نے "نوائے ادب کا آپ کا عطا کردہ شمارہ پڑھ لیا، خوب ہے۔ سارے مضامین اچھے ہیں اور بہت اچھے۔ آپ نے نہایت سلیقے اور محنت کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔ ظاہر ہے "نوائے ادب" کا اردو میں اپنا ایک مقام ہے۔ یقین ہے آپ کی وجہ سے یہ مقام اور بلند اور معتبر ہوگا۔ **ڈاکٹر سلیمان اطھر جاوید ۔ حیدرآباد**

● خدا کرے آپ مع متعلقین بعافیت ہوں۔ عرصۂ دراز کے بعد نوائے ادب کا تازہ شمارہ (اپریل ۱۹۹۸ء) دیکھا تو آنکھیں روشن ہو گئیں اور بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ بالخصوص اپنے پڑوسی بزرگ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب کی علمی لگن اور اخلاص عمل کے علاوہ چند برس قبل جناب سید حامد صاحب کی رہنمائی میں تعلیمی قافلے کے دوران، جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب جمخانہ والا کے جذب اندروں کی خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں۔ خاکسار بہار شریف کا رہنے والا ہے۔ اس اطلاع سے نہایت مسرت ہوئی کہ آپ نے انسٹی ٹیوٹ میں ڈائرکٹر کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ آپ کے ہمہ جہتی تجربات سے ادارہ کو یقیناً بڑے فائدے ہوں گے۔ ایک روشن پہلو تو سامنے ہے کہ "نوائے ادب" کا "پہلا تجربہ" خاصا کامیاب محسوس ہوا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے چاروں مقالے وقیع ہیں بلکہ انجمن کے 'سفر' سے بھی اس کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ ہوا۔ **اللھم زد فزد** ۔ یہ خبر نہایت حوصلہ افزا ہے کہ آپ حضرات کی کاوشیں بار آور ثابت ہوئیں اور ممبئی یونیورسٹی نے انسٹی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے لئے دائمی منظوری دیدی۔ دلی مبارکباد! **ڈاکٹر احمد سجاد ۔ رانچی یونیورسٹی ۔ رانچی**

مقالہ نما

مرتبین

☆ ڈاکٹر مجاهد حسین حسینی

☆ ڈاکٹر خورشید نعمانی

☆ پروفیسر انور ظهیر خاں

☆ نجمه شیخ

شخصیات

☆ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ بابت جنوری ۱۹۹۸ء ص ۳۱۔۳۳
"حکیم علی گیلانی۔ مشہور ہندوستانی طبیب"

☆محمد زکریا ورک ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ بابت جولائی ۱۹۹۸ء ص ۳۴۔۳۸
"منفرد امریکی سائنسداں ۔ چندرا شیکھر' اس میں مضمون نگار نے بھارتی سائنس داں شیکھر کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ان کی زیر نگرانی پچاس سے زائد طلبہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور انہیں نوبل انعام سے بھی نوازا گیا۔

☆مغنی تبسم سب رس، حیدر آباد، بابت ستمبر ۱۹۹۸ء ص ۲۱۔۵۱
"گوشہ شمیم حنفی" اس کے تحت سید خالد قادری، انور صدیقی اور سید وقار حسین کے خاکے اور مضامین ہیں نیز شمیم حنفی کے دو مضامین اور تین غزلیں بھی زینت ہیں۔

☆بیدار بخت ماہنامہ شب خون الہ آباد بابت جون ۱۹۹۸ص ۹۰۳
"اختر الایمان سے ایک گفتگو" اس میں اختر الایمان کی شخصیت اور فن کی کئی پرتیں کھلتی ہیں۔

☆شمس الرحمٰن فاروقی شب خون، الہ آباد، بابت جولائی ۱۹۹۸ء ص ۲۸۰۲۱
"اوکتاویوپاز پر گوشہ" جس میں احمد سہیل کے تعارف کے ساتھ ضمیر احمد، اندر سروپ سری واستو، چودھری محمد نعیم، وراثت شکوہ کشمیری نے پاز کی نظموں کے ترجمے کئے ہیں۔

☆ساجد رشید سہ ماہی "نیاورق" ممبئی۔ بابت اپریل تا ستمبر ۱۹۹۸ء ص ۲۱۔۲۸
عالمی شہرت یافتہ شاعر اوکتاویوپاز پر وجے کمار اور شکیل رشید کے تعارفی مضامین ہیں اور نظموں کے ترجمے بھی ہیں۔ ترجمہ م۔ ناگ نے کئے ہیں ۔

☆ساجد رشید:" سہ ماہی نیاورق " ممبئی بابت اپریل تا ستمبر ۱۹۹۸ ص ۶۸۔۸۵
'بریخت پر گوشہ "بریخت پر اقبال نیازی کے تعارفی مضمون کے ساتھ اس کی ۳۶ نظمیں بھی دی گئی ہیں۔ جن کے ترجمے یعقوب راہی اور اقبال نیازی نے کئے ہیں۔

☆عاشور کاظمی + علی احمد فاطمی ششماہی "نیا سفر، الہ آباد (یوپی) بابت جنوری تا جون ۱۹۹۸ء
"گوشہ فراق" اس گوشے کے تحت رام سروپ چترویدی، شمس الرحمٰن فاروقی، سید محمد عقیل، محمود الحسن رضوی، راجندر کمار، پرمانند سریواستوا، افغان اللہ، شمیمہ رضوی، سعید عارفی، رفیع اللہ، امر کانت، مجتبیٰ حسین کے مضامین درج ہیں۔ ان کے علاوہ فراق پر دو نایاب مضامین بھی شامل ہیں اور فراق پر دو نئی کتابوں کا ذکر بھی موجود ہے۔
☆ڈاکٹر یونس اگاسکر سہ ماہی "ترسیل" ممبئی بابت اپریل تا جون ۱۹۹۸ ص ۴۱۔ ۴۳
"یاد عصمت" اس کے تحت عصمت چغتائی سے لئے گئے تین انٹرویو شامل ہیں جو مختلف اوقات میں ڈاکٹر یونس اگاسکر، ڈاکٹر افسر فاروقی اور جلیل بازید پوری نے لئے تھے۔
☆گوہر نوشاہی ڈاکٹر "حیات غالب سنین کے آئینے میں "اخبار اردو (م) اسلام آباد، ج/۱۵ ش ۲، فروری ۱۹۹۸ء ص ۱۱ تا ۱۳
غالب کے حالات زندگی کو سن عیسوی کے حساب سے ترتیب کیا گیا ہے۔
☆جعفری، عقیل عباس "حیات سرسید ماہ و سال کے آئینہ میں" اخبار اردو (م) اسلام آباد، ج/۱۵ ش ۳، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۱۵ تا ۱۹ یہاں حیات سرسید احمد خان، بلحاظ تاریخ، ماہ، سن ہجری درج ہے اور ان کی کئی تصانیف بلحاظ حروف تہجی۔
☆اصغر عباس، پروفیسر "پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یاد میں "معارف (م) اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۸ء، ج ۱۶۱ ش (۱) ص ۷۰ تا ۷۷
پروفیسر خلیق احمد نظامی پر تعزیتی مقالہ ہے۔
☆اصلاحی ضیاء الدین "مولانا امین احسن اصلاحی" معارف (م) اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۸ء، ج ۱۶۱، ش ۱، ص ۵۵ تا ۶۹
مولانا امین احسن اصلاح پر تعزیتی مقالہ ہے
☆محمد ظہیر الدین احمد "ڈاکٹر غلام دستگیر رشید" اقبال ریویو (ش) حیدر آباد جون ۹۸ء، ج ۷ ش ۱، ص ۵ تا ۹
اقبالیات سے منسلق اور ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کی خدمات اور کارناموں کا اجمالاً تعارف پیش کیا گیا ہے
☆نویدی علیم صبا "نواب محمد غوث خان اعظم، حیات و خدمات" ہماری زبان (ہفت واری) نئی دہلی 98-9-8 ج ۵۷، ش ۳۴، ص ۲ تا ۳ ایک عمدہ معلوماتی خاکہ ہے۔
☆ساحل احمد "احسان شاہجہانپوری" ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی 98-6-22 ج ۵۷، ش ۲۴، ص ۸۔ ۷
انیسویں صدی کے ایک نایاب رسالے "ارمغان" اور احسان شاہجہانپوری کی شاعری پر مختصر معلوماتی مضمون ہے۔
☆گیلانی، منور "عطا کاکوی" ہماری زبان (ہفت رورہ) نئی دہلی 98-5-22 ج ۵۷، ش ۲۰، ص ۸۔ ۷
مرحوم پروفیسر عطا کاکوی کی ستر سالہ ادبی زندگی کے احاطہ کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں ان کی مختلف تصانیف و تالیفات کی فہرست بھی درج ہے۔
☆رفعت سروش "شہاب ثاقب" ہماری زبان (ہفت روزہ نئی دہلی 98-5-8 ج ۵۷، ش ۱۸ ص ۸۔ ۶
بہ یاد مرحوم سید شہاب الدین دسنوی ایک تعزیتی مضمون ہے۔

ادبیات

☆ڈاکٹر رفیق الغنی ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، بابت جون ۱۹۹۸ ص ۳۵۔ ۳۸ ۔ "سرسید احمد خان کا طرز فکر اور طریق

عمل"۔ اس میں مضمون نگار نے سرسید کے طرزِ فکر اور طریقِ عمل کا بڑی عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔

"اخلاقی اقدار اور اردو ادب" اس میں بیگ صاحب نے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے مجموعہ مقالات "میزان قدر" کے حوالے سے اردو ادب میں اخلاقی اقدار کا سراغ لگایا ہے۔

☆ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ، بابت جولائی ۱۹۹۸ص ۹۔۱۵

"مولانا محمد علی کی اردو صحافت کے اہم موضوعات و خصوصیات" اس میں مولانا کی صحافت کا کماحقہ، جائزہ لیا گیا ہے۔

☆پروفیسر گوپی چند نارنگ ماہنامہ کتاب نمانئی دہلی۔ بابت جولائی ۱۹۹۸ص ۷۔۳۱

"جمیل الدین اور آٹھویں سر کی جستجو" مشہور و معروف پاکستانی شاعر جمیل الدین عالی کی شاعری پر بسیط مضمون

☆انتظار حسین ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی۔ بابت اگست ۱۹۹۸ء ص ۷۔۱۰

"اردو کا تہذیبی مزاج" اردو کی پرانی تہذیب پر مختصر مگر جامع مضمون۔

☆ڈاکٹر گیان چند جین ' ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی۔ بابت اکتوبر ۱۹۹۸ص ۱۵۔۳۵

"خود نوشتہ دیوان غالب اور الزام جعل سازی" اس میں موضوع پر بحث کرتے ہوئے اردو کے ادیبوں، نقادوں اور عالموں کی فکر اور رویے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اعجاز احمد ترجمہ اسامہ فاروقی۔ ماہنامہ سب رس، حیدر آباد۔ بابت جنوری ۱۹۹۸ء ص ۲۲۔۳۳

"اردو کے تعلق سے چند افکار" مضمون میں ماقبل آزادی اور مابعدِ آزادی ہند و پاک میں اردو زبان و ادب کی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

☆مغنی تبسم۔ ماہنامہ سب رس، حیدر آباد، بابت اگست ۱۹۸۹ء ص ۳۔۳۴

"جدوجہدِ آزادی میں اردو ادب اور صحافت کا حصہ" یہ ایک طرح کا گوشہ ہے جس میں اردو ناول، افسانے، شاعری اور صحافت پر بالترتیب یوسف سرمست، بیگ احساس، اشرف رفیع اور محمد انور الدین کے مضامین ہیں۔

☆یوسف میخائلوچ ارانسکی، تلخیص و ترجمہ اسامہ فاروقی۔ ماہنامہ سب رس، حیدر آباد، بابت اگست ۱۹۹۸ ص ۳۵۔۴۳

"حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان" تاجکستان کی وادی حصار میں آباد ہندی الاصل قوم پریا کی زبان اور لوک کہانیوں پر سیر حاصل بحث۔

☆مانک ٹالا سہ ماہی ہندوستانی ممبئی" بابت جولائی۔ ستمبر ۱۹۹۸ء ص ۵۔۹

"اردو، ہندی، ہندوستانی اور پریم چند" ایک مختصر مگر جامع مضمون

☆وارث کرمانی ماہنامہ شاعر، ممبئی، بابت مارچ ۱۹۹۸ء ص ۶۔۱۱

"سردار جعفری" سردار جعفری کے فکری اور شعری رویے کا بے لاگ تجزیہ۔

☆انیس اعظمی۔ ماہنامہ شاعر، ممبئی، بابت مئی ۱۹۹۸ء ص ۷۔۱۰

"اردو تھیٹر کی بازیافت کیوں اور کیسے" اس میں مضمون نگار نے انتہائی اختصار کے ساتھ ڈرامے کے مسائل اور امکانات پر بات کی ہے۔

☆ تحسین فراقی ماہنامہ شاعر، ممبئی بابت ستمبر ۱۹۹۸ص ۵۔۱۱
"بانگ درا کا پہلا مکمل انگریزی ترجمہ" اس میں فاضل مضمون نگار نے ناقص شعر فہمی کی وجہ سے غلط ترجمے کی جانب اشارے کئے ہیں۔
☆ سردار جعفری ماہنامہ شب خون۔ الہ آباد، بابت جنوری ۱۹۹۸ص ۹۔۱۹
"سرمایۂ سخن" اس میں مختلف ادوار میں مختلف الفاظ کے سفر پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اشعار کے حوالے بھی دیئے ہیں۔
☆ مہدی جعفر، حامدی کاشمیری۔ ماہنامہ شب خون، الہ آباد، بابت مئی ۱۹۹۸ص ۶۔۱۵
"قرۃ العین حیدر کے افسانے "فوٹوگرافر" کا تجزیہ مہدی ٹونکی اور سریندر پرکاش کے افسانے "سرنگ" کا تجزیہ حامدی کاشمیری نے کیا ہے۔
☆ قاضی جمال حسین' ماہنامہ شب خون، الہ آباد، بابت جولائی ۱۹۹۸ص ۹۔۱۴
"محمد علوی کا طریقہ کار (نظموں کے حوالے سے) جدید شاعر محمد علوی پر ایک وقیع مضمون ہے۔
☆ علی سردار جعفری شب خون، الہ آباد، بابت جولائی ۱۹۹۸ص ۵۔۱۳
"سرمایہ سخن" اس میں لفظ آتش کو موضوع بنا کر اردو شاعری میں عہد بہ عہد اس کے سفر کا حال لکھا ہے اور حوالے بھی دیئے ہیں۔
☆ چودھری محمد نعیم شب خون، الہ آباد، بابت اگست ۱۹۹۸ص ۱۹۔۲۳
"فیض کی ایک نظم۔ دو مطالعے "یہاں فیض کی نظم "دست تہہ سنگ آمدہ" پر جو چودھری محمد نعیم اور آفتاب احمد خاں کے تجزیے سجائے گئے ہیں۔
☆ مہدی جعفر شب خون، الہ آباد، بابت اگست ۱۹۹۸ص ۴۵۔۵۵
"نیر مسعود کا فن اور شیشہ گھاٹ" اس میں اس افسانے اور ان کے فن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔
☆ سیفی سرونجی سہ ماہی انتساب، سرونج (ایم۔پی) بابت مئی ۱۹۹۸ص ۵۔۱۵
"نئی غزل نئے امکانات" اسی موضوع پر یہ چھٹی قسط ہے جس میں نیک نام اور بدنام غزل گویوں کے ساتھ کم نام اور بے نام شاعروں کا ذکر بھی آگیا ہے۔
☆ سلیم آغا قزلباش سہ ماہی انتساب، سرونج (ایم۔پی) بابت مئی ۱۹۹۸ص ۱۹۔۲۶
"جدید افسانے میں کردار نگاری" یہ ایک اچھے زاویے سے لکھا ہوا مضمون ہے۔
☆ احمد کمال پرواری سہ ماہی انتساب، سرونج (ایم پی) بابت ۱۹۹۸ص ۵۶۔۶۷
"ویوندر اسر اور مابعد جدیدیت" اس مضمون میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بہت سے مباحث سمٹ آئے ہیں۔
☆ سیفی سرونجی سہ ماہی "انتساب" سرونج (ایم۔پی) بابت ستمبر ۱۹۹۸ء ص ۳۔۱۶
"نئی غزل نئے امکانات" ساتویں قسط گزشتہ سے پیوستہ
☆ مختار شمیم سہ ماہی "انتساب" سرونج (مدھیہ پردیش) بابت ستمبر ۱۹۹۸ص ۱۷۔۲۲
"ہمارا ادب اور قدروں کا مسئلہ" ایک اچھا اور مختصر مضمون
☆ مہدی ٹونکی سہ ماہی "نیا ورق" ممبئی۔ بابت اپریل تا ستمبر ۱۹۹۸ص ۸۶۔۹۶

"منٹو کی ایک ناکام کہانی کھول دو کا تجزیہ۔ مہدی ٹونکی نے منٹو کی مشہور اور اختلافی کہانی کا ایک نئے زاویے سے تجزیہ کیا ہے جو چونکاتا ہے اور بحث کے نئے دروازے کھولتا ہے۔

☆عاشور کاظمی + علی احمد فاطمی ۔ ششماہی "نیا سفر" الہ آباد (یوپی) بابت جنوری تا جون ۱۹۹۸ص ۸۱ تا ۱۹۸

"گوشہ ناول "اس گوشے میں ناول نگاری اور ناولوں پر دلچسپ اور معلومات افزا مذاکرہ ہے۔ گذشتہ بیس برسوں میں آنے والے چند اہم ناولوں پر تبصرے ہیں۔ فیاض رفعت کے زیر تصنیف ناول "بنارس والی گلی" کی پہلی قسط ہے۔

☆نامی انصاری ششماہی "نیا سفر" الہ آباد (یوپی) بابت جنوری تا جون ۱۹۹۸ص ۲۱۲۔ ۲۲۳

"جدید غزل سے رازونیاز" ایک ایسا مضمون جو دعوت فکر دیتا ہے۔

☆ناصر بغدادی سالنامہ "بادبان" کراچی، پاکستان۔ بابت جولائی ۱۹۹۷ تا ستمبر ۱۹۹۸ص ۲۴۷۔ ۲۵۵

اس میں اسلوب احمد انصاری۔ حمید نسیم، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر سلیم اختر ابوالکلام قاسمی، شافع قدوائی اور ناصر بغدادی کے مضامین خاصے کی چیز ہیں۔ اس کے علاوہ صفحہ ۲۱۲۔ ۲۲۵ ناصر بغدادی کا ٹامس جان کے ناول کو ہ افسوں The Magic Mountain کا تجزیاتی مطالعہ " بھی ایک اہم مضمون ہے۔

☆ڈاکٹر آدم شیخ ششماہی "نوائے ادب" ممبئی، بابت اپریل تا ستمبر ۱۹۹۸ص ۶۔ ۶۰

اس کے حصہ مضامین میں ڈاکٹر خورشید نعمانی، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی اور ڈاکٹر اکبر رحمانی کے مضامین شامل ہیں۔

☆سلیم شہزاد سہ ماہی "ترسیل" ممبئی، بابت جنوری تا جون ۱۹۹۸ص ۶۔ ۱۳

"غالب کا لسانی شعور" اس کے ذریعہ زبان و بیان کے سلسلے میں غالب کی ترجیحات اور معیارات کا پتہ چلتا ہے۔

☆شمیم حنفی سہ نامہ "جامعہ" نئی دہلی۔ بابت اپریل تا جون ۱۹۹۸ص ۹۴۔ ۱۲۴

"خصوصی مطالعہ" اس حصے میں ڈپٹی نذیر احمد پر مرزا حامد بیگ اور اشفاق محمد خاں کے مضامین ہیں۔

☆ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی سہ ماہی "جامعہ" نئی دہلی۔ بابت اپریل تا جون ۱۹۹۸ ص ۱۲۵۔ ۱۵۲

"سردار جعفری کا شعری سفر" اس میں سردار جعفری کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

☆ڈاکٹر ایم حمید اللہ بٹ ششماہی فکر و تحقیق" نئی دہلی بابت جنوری تا جون ۱۹۹۸ص ۵۔ ۴۱۸

"نو آبادیاتی فکر کے منفی اثرات۔ اردو زبان و ادبی نظریات پر" اس موضوع پر ۱۷ تا ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء میں منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالے شامل ہیں۔ ہر مقالہ اپنے موضوع پر محیط ہے۔

☆نواز محمد طائر پروفیسر

"اردو پشتو لسانی اور ثقافتی روابط"

اخبار اردو (م) اسلام آباد، ج ۱۵، ش ۱؛ جنوری ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۵۔ ۲۰

برصغیر ہندوستان کی تاریخی، ثقافتی اور لسانی تاریخ پر زور دیتے ہوئے پشتو اور اردو زبان کی لسانی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔

☆سنگھ مجذوب، گوردیال

"سنسکرت زبان کی لغوی برتری"

معارف (م) اعظم گڑھ، ج ۱۶۲، ش ۱، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۵۸ تا ۶۲

متعدد زبانوں کے ماہر، مقالہ نگار نے یہاں اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ یہ لسانیات پر ایک اہم مقالہ ہے۔

☆ شبلی ڈاکٹر محمد صادق

"اردو اصطلاح سازی کے جدید تقاضے"

اخبار اردو (م) اسلام آباد، جون ۱۹۹۸ء، ج ۱۵، ش ۶، ص ۸ تا ۱۳

اصطلاح سازی کی تاریخی اہمیت اور کام کو سراہتے ہوئے بین الاقوامی اداروں کے لئے کام کرنے کی اہمیت بتلائی گئی ہے۔

☆ سلیم اختر ڈاکٹر

"اردو میں لسانی تحقیق کے جدید رجحانات"

اخبار اردو (م) اسلام آباد، مئی ۱۹۹۸ء، ج ۱۵، ش ۵، ص ۸ تا ۱۴

اردو میں لسانی تحقیق کی تاریخی اہمیت بتلاتے ہوئے، اساطیر اور علم الانسان کے علاوہ کمپیوٹر کی ٹیکنیک پر بھی زور دیا گیا ہے۔

☆ الیاس اعظمی محمد

"علامہ شبلی کی سیرۃ النبی ﷺ"

معارف (م) اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۸ء، ج ۱۶۱، ش ۱، ص ۵۵ تا ۶۹

علامہ شبلی کی شہرہ آفاق تصنیف "سیرۃ النبی" جس کا عربی، انگریزی، پشتو، ملیالم اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس پر یہ تفصیلی مقالہ دو قسطوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی قسط فروری ۱۹۹۸ء صفحہ نمبر ۹۸ تا ۱۱۷ پر ملے گی۔

☆ کم، یونگ، کیو، ڈاکٹر

"اردو کا لفظ کوریائی زبان "ار" سے نکلا ہے

اخبار اردو (م) اسلام آباد، جولائی ۱۹۹۸ء، ج ۱۵، ش ۷، ص ۷ تا ۱۱ اور ۱۸

مندرجہ بالا عنوان کے تحت تفصیلی مضامین تاریخی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین "قومی زبان" (کراچی) سے ماخوذ ہیں۔

☆ نقطۂ نظر

نئی کتابوں کے تعارف و تبصرے پر مشتمل مجلّہ"

نقطہ نظر (ش۔م) (اسلام آباد) اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء ش ۱ ص ۳۶۔۱۱۳

اسلامیات پر پاکستان میں شائع شدہ نئی کتابوں کا تعارف علاوہ ازیں تفصیلی تبصرہ ملتا ہے۔

☆ فاروقی شمس الرحمٰن

"تبصرہ نگاری کا فن"

نقطہ نظر۔ ش، م (اسلام آباد) اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء ش۔، ص ۷ تا ۱۳

تبصرہ نگاری کے اخلاقی اور علمی مسائل کے کچھ ضروری امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

☆اختر راہی
"اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت"
نقطہ نظر۔ ش،م (اسلام آباد) اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء ص۔ا، ص ۱۴ تا ۳۵
حوالے اور حواشی کے ساتھ نہایت تفصیل سے تبصرہ نگاری کی روایت کا اردو ادب کی تاریخ کی روشنی میں قلمبند کیا ہوا مضمون ہے۔
☆اکبر رحمانی، ڈاکٹر
"خاندیش میں اردو شاعری کی روایت"
نوائے ادب۔ش، ممبئی: اپریل ۱۹۹۸ء ج ۴۸ ش ا، ص ۵۰ تا ۶۰
خاندیش کے تاریخی پس منظر میں مصنف نے بڑی جان فشانی کے ساتھ اردو شاعری کی روایت پر یہ مقالہ قلمبند کیا ہے۔
☆نعمانی ڈاکٹر خورشید مظہر الحق
دارالمصنفین۔ مولانا شبلی کی تصنیفی تحریک (پہلی قسط)
نوائے ادب (ش۔م) ممبئی، اپریل ۱۹۹۸ء ج ۴۸، ش۔ ا ص ۶ تا ۲۱
مختلف سرخیوں کے ساتھ، ہندوستان کی تاریخ و ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں سرسید کی تجدید، اصلاحی کوشش، علمی کاوشیں، سرسید کے رفقاء اور مولانا شبلی پر تفصیلی بحث ہے۔
☆بدیع الزماں خاور
"کلیات اقبال میں عشق خودی اور فقر کے اشاریے"
معارف (م) اعظم گڑھ اگست ۱۹۹۸ء ج ۱۶۲، ش ۲ . ص ۱۳۲۔ ۱۴۷
عشق، خودی اور فقر کے موضوعات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔
☆ہاشمی، ڈاکٹر عقیل
فکر اقبال کا شارح
اقبال ریویو (ش) حیدر آباد، جون ۱۹۹۸ء ج ۷ ش ا، ص ۲۰ تا ۳۵
'فکر اقبال کا شارح" کے مصنف خلیفہ عبد الحکیم کا جامع تذکرہ کرتے ہوئے ان کے اقبالیات کے نظریہ کو ہاشمی صاحب نے کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔
☆بیگ احساس، ڈاکٹر
"امین روح اقبال ۔ڈاکٹر یوسف حسن خان"
اقبال ریویو (ش) حیدر آباد. جون ۱۹۹۸ء ج ۷، اش ، ص ۵۲ تا ۷۵
اقبال کی شاعری پر تفصیلی بحث اور اولین حصہ میں ڈاکٹر یوسف حسن خان کا تذکرہ حیات ہے۔
☆نقوی، سید قدرت

"لغت نگاری"

اخبار اردو (م) اسلام آباد ستمبر ۱۹۹۸ء ج ۱۵، ش ۹ ص ۳۰ تا ۶۰

لغت نگاری پر تفصیلی مضمون کا پہلا حصہ جس میں تاریخ اور اقسام کے متعلق بحث ہے۔ جبکہ متن لغت کا تذکرہ (قسط نمبر ۲) ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔

☆ منگوری، شکیل احمد

مقتدرہ قومی زبان اور وضع اصطلاحات

اخبار اردو (م) اسلام آباد ستمبر ۱۹۹۸ء ج ۱۴، ۱۰ ش ص ۱۹ تا ۲۱

اصطلاح سازی کے فنی اور لسانی پہلوؤں پر بحث ملتی ہے۔ اس کی دوسری اور آخری قسط ۱۸ تا ۲۰ صفحات پر اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

☆ سید یحییٰ نشیط ڈاکٹر

مولانا سید سلیمان ندوی کی مقدمہ نگاری

معارف (م) اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۹۸ء ج ۱۶۲ ش ۳

ص ۱۹۰ تا ۲۰۳ پہلی قسط ۲۸۵ تا ۲۹۷ دوسری قسط

مقدمہ نگاری کی اہمیت اور مختصر تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے مصنف نے اس مقالے میں ان تیرہ نایاب تصانیف کا ذکر کیا ہے جن پر مولانا سید سلیمان ندوی نے مقدمے لکھے ہیں۔

☆ سید حسن عباس۔ ڈاکٹر

"آزاد بلگرامی کی عربی خدمات"

معارف (م) اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۹۸ء ج ۱۶۲ ش ۳ ص ۲۰۴ تا ۲۲۱

آزاد کے عربی قلمی نسخوں کی تفصیلی معلومات اور ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

☆ شکیل الرحمٰن

بابو راجندر پرشاد -- زبان کا مسئلہ

ہماری زبان (ہفتہ واری) نئی دہلی، ۲۲ ستمبر ۱۹۹۸ء شمارہ ۳۶ ج ۵۷ ص ۱

ڈاکٹر راجندر پرشاد کے لسانی نظریے پر بحث ملتی ہے۔

☆ اختر، ڈاکٹر جمیل

عصمت کے اولین ناقد

ہماری زبان (ہفتہ واری) نئی دہلی ۸-۱۰-۹۸ ج ۵۷، ش ۳۸ ص ۲۔۳

عصمت چغتائی کے فن کا تجزیہ اور ناقدین کی رائے پر بحث کی گئی ہے۔

☆ حنفی، ڈاکٹر مظفر

"تحریک آزادی میں شعراء اردو کا کردار"
ہماری زبان (ہفتہ واری) نئی دہلی ۹۸۔۱۰۔۲۲ ج ۵۷ ش ۴۰ ص ۱ تا ۲ اور ۷
عنوان سے مضمون عیاں ہے۔
☆سکینہ ویریندر پرشاد
"دلاور فگار-ایک مطالعہ"
ہماری زبان (ہفتہ واری) نئی دہلی ۹۸۔۱۱۔۱ ج ۵۷ ش ۴۱ ص ۳
مرحوم دلاور فگار کی ادبی زندگی کی ایک جھلک پیش کی ہے اس میں وہ نظم بھی ملتی ہے جو ان کے مجموعہ کلام میں نہیں ہے۔
☆ممتاز احمد خان، ڈاکٹر
"عہد غالب میں اردو اخبارات کی نثر"
ہماری زبان (ہفتہ واری) نئی دہلی ۹۸۔۹۔۸ ج ۵۷، ۳۴ ص ۱ تا ــ
انیسویں صدی کی تیسری دہائی سے اخبارات شائع ہو رہے ہیں ان میں آسان زبان کے ساتھ خبروں کو دل آویز بنانے کے اور زیب داستاں کے لئے واقعات کو ڈرامائی رنگ دینے کے طریقوں کا بیان ہے۔
☆حبیب نثار، ڈاکٹر
دکن کی ایک اہم تصنیف۔ کتاب نورس
ہماری زبان (ہفت واری) نئی دہلی ۹۸۔۹۔۸ ج ۵۷، ش ۲۳ ص ۱ تا ۲ باقی ۶ تا ۷
ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) کی تصنیف پر تفصیلی بحث۔
☆مظفر شاہ، میری
"تحریک آزادی کی شاعری اور اردو کی شعری روایات"
ہماری زبان (ہفتہ روزہ) نئی دہلی ۹۸۔۸۔۸ ج ۵۷، ش ۳۰، ص ۸۔۶
پہلی قسط ۹۸۔۸۔۱ ج ۵۷، ش ۲۹ ص ۸۔۷
دلائل پر مشتمل دو قسطوں کا مضمون اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تحریکِ آزادی کے لئے اردو کی شعری روایات نے بنیادی کام کیا۔
☆عبدالمغنی ڈاکٹر
"میر انیس کا فن"
ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی: ۹۸۔۸۔۱: ج ۵۷، ش ۲۹: ص ۱۔۵
انیس کے فن کے چند رزمیہ عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

☆کالی داس گپتا رضا
"غالب ایک نئے دور کا آغاز"

ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۸-۶-۲۲ ج ۵۷، ش ۲۴ ص ا تا ۲
غالب کی شخصیت اور نجی زندگی پر ایک تفصیلی مضمون ہے۔

☆ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر
'اردو کے ممتاز ادیب پروفیسر عطا کاکوی"
ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۸-۶-۱۵ ج ۵۷، ش ۲۳، ص ا
عطا کاکوی مرحوم (انتقال ۱۸/ اپریل ۱۹۹۸ء) کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ۔

☆ انصاری، ڈاکٹر طیب
حیدر آباد میں خاکہ نگاری کا فن"
ہماری زبان (ہفت روزہ نئی دہلی ۹۸-۵-۸ ج ۵۷، ش ۲۲، ص ۱-۶
اقتباسات اور حوالوں کے ساتھ قلمبند کیا ہوا حیدر آباد کی خاکہ نگاری پر ایک عمدہ مضمون ہے۔

☆ شکیل الرحمٰن
'خواجہ حسن نظامی کا افسانوی مزاج"
ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۸-۶-۱، ج ۵۷، ش ۲۱ ص ا تا ۲
تخلیقی فنکار خواجہ حسن نظامی کی تصانیف کے حوالوں سے تیار کیا ہوا عمدہ مضمون ہے۔

☆ اکبر رحمانی، پروفیسر
"خاندیش میں اردو صحافت"
ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۸-۵-۲۲ ج ۵۷، ش ۲۰ ص ا
خاندیش کے اخبارات و رسائل پر تفصیلی اور معلوماتی مضمون ہے۔

☆ نویدی علیم صبا
تمل ناڈ میں اردو صحافت (دوسری اور آخری قسط)
ہماری زبان (ہفت روزہ9 نئی دہلی ۹۸-۵-ا ج ۵۷، ش ۱۷ ص ۳-۴
ایک عمدہ تفصیلی مضمون

☆ اکبر رحمانی
مغربی خاندیش کا پہلا ادبی رسالہ "البدر" دھولیہ
ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۸-۳-۲۲ ج ۵۷، ش ۱۲، ص ۱-۲
مغربی خاندیش (ضلع دھولیہ) کے ایک ادبی دوماہی رسالے "البدر" پر تفصیلی تبصرہ ہے۔

متفرقات

☆ ڈاکٹر محمد حبیب الحق انصاری: ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، بابت جنوری ۱۹۹۸ء ص ۱۸-۲۳

"قوموں کے عروج وزوال میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا کردار" ایک اہم مضمون ہے
☆ڈاکٹر قمر الدین، ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ بابت فروری ۱۹۹۸ ص ۵۲۔۵۶
"مقاصد تدریس۔ضرورت اور اہمیت" یہ مضمون درس وتدریس کے مقاصد کا احاطہ کرتا ہے۔

اسلامیات

☆جمشید احمد ندوی ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، بابت ستمبر ۱۹۹۸ ص ۲۰۔۲۷
"کشف المحجوب ۔ایک مطالعہ" تصوف کے موضوع پر لکھی ہوئی اس کتاب کی غرض و غایت بیان کی ہے اور اس کے موضوعات کا احاطہ بھی کیا ہے۔
☆عبدالسلام صدیقی ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ، بابت ستمبر ۱۹۹۸ ص ۴۹۔۵۵
"دارالعلوم دیوبند، مقاصد اور تعلیم" ایک جائزہ ،دارالعلوم کے قیام کے مقصد اور وہاں دی جانے والی تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
☆رفیق احمد
"مولانا امین احسن اصلاحی کا عظیم کارنامہ "تدبر قرآن"
معارف(م) اعظم گڑھ، ج ۱۶۲، ش ۱، جولائی ۱۹۹۸ء ص ۴۹ تا ۵۷
نو جلدوں پر مشتمل "تدبر قرآن" کی تفسیر پر حوالوں کے ذریعہ سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔
☆عبدالمغنی، پروفیسر
اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور علامہ اقبال
اردو بک ریویو(م) نئی دہلی، نومبر۔دسمبر ۱۹۹۷ء، ج ۶، ش ۲۵۔۲۶ ص ۷ تا ۱۷
اقبال کی تقریباً چالیس سالہ تحریروں اور تقریروں کا ماحصل، اس مضمون میں اسلامی نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔

وفیات

☆دسنوی عبدالقوی
سید شہاب الدین دسنوی
ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۵۔۸۔۸، ج ۵۷، ش ۳۰، ص ۱۔۳
ماہر تعلیم مرحوم سید شہاب الدین پر ایک سیر حاصل تعزیتی مضمون۔جس میں شہاب نامے، بنام عبدالقوی دسنوی بھی شامل کیے گئے ہیں۔
☆حسینی، ڈاکٹر مجاہد حسین
"دبستان آرزو کا ایک روشن چراغ"
ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی: ۹۸۔۷۔۲۲، ج ۵۷، ش ۲۸، ص ۸
مرحوم بیدل لکھنوی (انتقال ۷ ۲ر مارچ ۱۹۹۸ء کینیڈا) کی زندگی اور تعلیمی ذوق و شوق سے تعلق رکھتا ہوا تعزیتی مضمون

☆رشید الدین

"اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر"

ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۸-۷-۱۵ ج ۵۷ ش ۲۶، ص ۱

مزاح نگار مسیح انجم مرحوم، ایک صحافی اور مترجم تھے اور "رہنمائے دکن" (حیدر آباد) میں ادبی صفحہ مرتب کرتے تھے۔ ان کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔

☆سلیمان اطہر جاوید

"مسیح انجم"

ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۹۸-۷-۱۵، ج ۵۷، ش ۲۶، ص ۲

مسیح انجم مرحوم کی یاد میں تعزیتی مضمون

☆ایوب واقف محمد

"بشمبر ناتھ پانڈے۔ قومی یکجہتی کے عظیم علم بردار"

ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی ۸۹-۷-۱۵ ج ۵۷، ش ۲۶، ص ۸

انصاف پسند مورخ مرحوم بشمبر ناتھ پانڈے (۳۱ مئی ۱۹۹۸ء) پر تعزیتی مضمون

☆نگار اناوی

"یاد رفتگاں   آہ نگار بدایونی"

ہماری زبان (ہفت رورہ) ئی دہلی ۹۸-۶-۲۲ ج ۵۷، ش ۲۴، ص ۳-۴

مرحوم نگار بدایونی پر تعزیتی مضمون ہے۔

●❖●❖●

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ء میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام کرنا
تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعات سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ اردو کے فروغ کے سلسلہ میں امکانی کوشش کرنا

نوائے ادب، ممبئی (ششماہی)

ابتداء ۱۹۵۰ء

(سال میں دو بار اپریل اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

خصوصیات

اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر تبصرے

سال ۱۹۹۹ء سے نوائے ادب کی اشاعت سہ ماہی ہوگی اور رسالہ اپریل، جولائی، اکتوبر اور جنوری میں شائع ہوا کرے گا۔

سالانہ قیمت : اندرون ملک ۱۰۰/ روپے ❖ بیرون ملک ۱۰/ ڈالر

☜ ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ ☞

ڈائریکٹر
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ } ۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ۔ ممبئی ۰۰۱ ۴۰۰